ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

JULY 1986

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جولائی ۱۹۸۶ء

مُدیرِ منتظم:- نور محمد فلاحی

مُدیر:- طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

قیمت فی شمارہ ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ تعاون ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ (یو۔پی) ۲۷۶۱۲۱

رشاد آفسیٹ پریس اعظم گڑھ

نقوش حیات نو

اداریہ

بچوں کی تعلیم و تربیت اور ہندی مسلمان — ایڈیٹر — ۳

انٹرویو

ممتاز عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی سے ایک انٹرویو — ماخوذ — ۸

مقالات

شاہ ولی اللہ احیاء نظام اسلامی کے علمبردار — اظہار اثر — ۱۹

اسلامی تاریخ میں فن تعلیم کے ارتقائی مراحل — عارف اعظمی — ۲۳

حسن البنا سے میری پہلی ملاقات — عمر تلمسانی — ۳۰

عظمت کے مینار

حضرت ربیع بن زیاد حارثی رض — ابو جاوید — ۳۴

شعر و نغمہ

غزل — شرقی سبحانی — ۳۹

غزل — محمد عزیز صاحب الظاہری — ۳۹

تعارف و تبصرہ — ادارہ — ۴۷

حلقۂ یاراں — سید عبد الباری، رفیق احمد — ۵۱

جامعہ کے لیل و نہار — آل نشر — ۵۳

اداریہ

بچوں کی تعلیم و تربیت
اور
ہندی مسلمان

ہندوستان میں مسلمانوں کو جن اہم مسائل کا سامنا ہے اس میں ایک بنیادی اور اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی ہے۔ جیسے ہی بچہ تین سال کا ہوا والدین کے چہرے پر فکر کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ مختلف تعلیمی اداروں، مدرسوں اور اسکولوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے لگتے ہیں اور پھر چار و ناچار کسی نہ کسی میں اپنے بچے کو داخل کر دیتے ہیں۔

ہندوستان میں تعلیم کے تین متوازی نظام پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور ملک گیر سطح پر گورنمنٹ کا تعلیمی نظام ہے جو سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ کے دعویٰ کے مطابق یہ ایک سیکولر نظام تعلیم ہے جو اچھا شہری فراہم کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ سیکولر نظام تعلیم کا مطلب ہوتا ہے ایسا نظام تعلیم جو کسی مذہب کا کچھ ذکر نہ کرتا ہو اور تمام مذاہب کی مثبت تعلیمات پر مشتمل ہو نیز تمام مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان احترام کے یکساں جذبات پروان چڑھاتا ہو۔ کیا ہمارے ملک کا سیکولر نظام تعلیم ایسا ہے؟ جب ہم اسکول اور کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو دیکھتے ہیں تو عملاً اس کی نفی ہوتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے اسٹوڈنٹ الا ماشاء اللہ اپنے اخلاق و کردار اور رہن سہن سے کسی اچھے شہری کا کردار ادا کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ عوام و خواص ان سے ہر سطح پر نالاں ہیں۔ اور نصاب تعلیم کا حال اس سے بھی برا ہے۔ یہ ہندی مسلمانوں کے لیے سم قاتل ہے۔ اور ان کے تشخص کو تبدیل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ سیکولر ہے مگر اکبر الہ آبادی کی اس شعر کی مصداق ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ نصاب تعلیم ہندو اکثریت کا ترجمان ہے اور اس میں ہندو مائتھالوجی Mythology کی تعلیم دیجاتی ہے۔ آپ ادب کی کوئی کتاب اٹھا لیجئے آپ دیکھیں گے کہ درجہ دوم سے رام لچھمن سیتا، راون اور شری کرشن کے واقعات شروع ہوتے ہیں اور کلاس کے ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ہندو تہذیب اور کلچر کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کیجاتی ہاں اگر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سبق شامل کر لیا تو وہ ایسا توڑ مروڑ کر اور حقائق کی نفی کرتا نظر آئے گا کہ اس سے ایک مکروہ اور گھناؤنی شکل ہی بنے گی۔ اور اگر کسی نے مزید کشادہ ظرفی کا ثبوت دیا تو مسلم بادشاہوں کی ایسی تاریخ پڑھائی جائے گی جس سے ایک جابر، ظالم اور خونخوار قوم کا نقشہ ہی سامنے آئیگا گویا مسلمان بچوں کو اس پوزیشن میں لا کھڑا کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اگر ہندو نہ بن سکیں تو مسلمان بھی نہ رہ جائیں۔

دوسرا نظام تعلیم وہ ہے جسے عیسائی مشنریاں اور مبلغین چلاتے ہیں، یہ پرائمری سطح سے لے کر کالج کی سطح تک پائے جاتے ہیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے ٹیچرس عیسائی عقیدہ اور مذہب پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور نصاب تعلیم و تربیت کچھ اس انداز کا مرتب کیا گیا ہے کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی اور ادب کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے نیز طلبہ پر عیسائیت کی گہری چھاپ بھی ڈالی جائے۔ یہاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کسی انصاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ان کا دعوی بھی نہیں ہے، یہاں زیر تعلیم طلبہ کے صاف و شفاف اور سادہ ذہن کے پردے پر عیسائیت کے نقوش بنائے جاتے ہیں اور اسلام کے خلاف غلط فہمیاں اور شکوک پیدا کئے جاتے ہیں، نتیجے کے اعتبار سے سیکولر نظام تعلیم اور یہ دونوں برابر ہیں اور مسلمانوں کے لئے یکساں مضر۔

تیسرا نظام تعلیم وہ ہے جس کو مسلم تنظیمیں، تحریکیں، ادارے، انجمنیں اور عوام چلاتے ہیں پورے ملک میں اس کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں یہ مدرسے، پرائمری اور اعلی سطح پر پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جب مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے اور انگریزوں نے ایک منصوبہ بند طریقے سے اسلام اور مسلمانوں پر حملے کئے اور جب اسلامی تشخص اور اسلامی تہذیب و تمدن کو خطرہ لاحق ہوا، تو ایسے افراد کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی جو اسلام کی نمائندگی کر سکیں اور ایک ایک بستی، گاؤں اور شہر میں اس طرح جم جائیں کہ مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہیں اور ان کو کوئی بہکا نہ سکے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دار العلوم دیوبند (۱۸۶۷ء)، مظاہر العلوم سہارنپور (۱۲۸۳ھ)، دار العلوم الاشرفیہ سورت (۱۲۸۶ھ)، الجامعۃ النظامیہ حیدرآباد وغیرہ مدارس وجود میں آئے۔ ان مدارس میں قرآن و حدیث، فقہ، منطق فلسفہ اور انھیں سے متعلق علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں نے عربی مدارس کا ایک جال بچھا کر امت مسلمہ کی حفاظت اور رہنمائی کا فریضہ حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ جدید تعلیم سے تعرض نہیں کیا گیا تھا اور خالص عربی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اس لئے ملت کے اندر دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ تھا جو سیکولر ذہن رکھتا تھا اور جدید تعلیم و تہذیب کا دلدادہ تھا۔ وہ جدید تعلیم کے ذریعہ اعلی مناصب تک پہنچنا چاہتا تھا اور دوسرا طبقہ عربی علوم کا دلدادہ اور جدید رجحان اور تقاضوں سے بے نیاز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تشکیک و ریب کا شکار ہوا اور دوسرا منطقی بحثوں میں الجھ گیا۔

اسلام کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے جہاں قرآن، حدیث، فقہ و تاریخ پر گہری نظر کی ضرورت تھی وہیں مخالفین کی زبان، طرز استدلال، اسلوب کلام، رجحانات اور نظریات سے واقفیت بھی نہایت ضروری تھی، اس کے بغیر اسلام کی واضح، روشن اور مبین تعلیمات کو ہم پیش نہیں کر سکتے تھے اور مخاطب کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ اس کا احساس مسلمانوں کو ہوا اور ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۳۱۲ھ) کا قیام اسی احساس کا نتیجہ تھا، لیکن ندوہ میں چونکہ جدید علوم برائے نام ہی داخل نصاب تھے اس لئے یہ ان ضرورتوں کو پورا نہ کر سکا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے بیداری بڑھتی گئی مسلمانوں کا احساس شدید ہوتا گیا کہ ایک ایسا نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔ بلریا گنج اعظم گڈھ کے چھوٹے سے گاؤں میں جامعۃ الفلاح کا قیام اسی شدت احساس کا نتیجہ تھا۔ اور دسمبر ۱۹۶۲ء میں باقاعدہ

اس تجربہ کا آغاز ہوا اور خدا کے فضل سے آج تک کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ جامعہ کے دستور میں اس کے اغراض و مقاصد کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ ایسے افراد تیار کرنا (الف) جو قرآن و سنت کا گہرا علم اور گہری دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

(ب) جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر بھی ہو اور جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

(ج) جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔

(د) جنہیں احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو۔

(ہ) جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

۲۔ ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لانا جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہو۔

(از دستور جامعہ ص ۲-۳)

جامعہ کا نصاب کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ قرآن و حدیث، فقہ و تاریخ اور ادب و فلسفہ میں دسترس کے ساتھ ساتھ انگریزی، ہندی، فارسی، تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس مبادیات، سیاسیات، معاشیات پر بھی اچھی خاصی نظر ہو جائے تاہم ان جدید علوم پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے نیز جامعہ کے ارباب حل و عقد اگر تخصص کا شعبہ قائم کریں اور فارغین جامعہ کو ایسے مواقع فراہم کریں کہ وہ ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، صحافت، ادیان کا تقابلی مطالعہ میں اپنی صلاحیتوں کو آگے بڑھائیں تو یہ قوم، مذہب، ملت اور خود جامعہ کی ایک عظیم خدمت ہوگی۔ خدا ہمیں اس کی توفیق دے۔

ہم ایک مسلم ملت ہیں اور مسلمان، مسلمان خاندان میں پیدا ہونے سے نہیں ہوتا بلکہ کچھ اصول کچھ ضابطے اور قوانین کو ماننا اور تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ قرآن و حدیث ہمارے مذہب کے وہ بنیادی ماخذ ہیں جن کو سیکھنا اور جن کے احکام پر عمل کرنا ہمارے لئے فرض کیا گیا ہے۔ ان کے علم کو "العلم" کہا گیا ہے اور دنیا و آخرت کی کامیابی انہیں پر منحصر ہے اس سے ہم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتے بلکہ ان کو سکھانے اور پڑھانے کا انتظام ہمیں کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف ہم ایک امت وسط بھی ہیں جو خدا کے پیغام کی امین اور دنیا والوں کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے مامور من جانب اللہ ہے ایسی صورت میں مخاطب کی زبان، اسلوب، استدلال، نظریات رجحانات کا سمجھنا اور مطالعہ کرنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے اس کے بغیر ہم خدا کے پیغامات کو بندگان خدا تک نہیں پہنچا سکتے اس لئے وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ ہم اپنے نصاب تعلیم پر توجہ دیں اور ایسا نصاب تعلیم بنائیں جو قدیم و جدید دونوں سے ہم آہنگ ہو اور جو ہماری امنگوں کا ترجمان۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو یہ کتنا بڑا سانحہ ہوگا کہ بچے ہمارے ہوں، وہ پیدا ہم خرچ کریں، مشقتیں ہم برداشت کریں اور تعلیم و تربیت کے لئے دوسروں کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ ان کے صاف شفاف اور پاکیزہ ذہن پر سیکولرزم، سوشلزم اور عیسائیت کے نقوش بنائیں۔ کاش خدا ہمیں توفیق دیتا!

طارق [illegible]
۲۹/۶/۱۹۹۹

(بقیہ حلقہ یاراں)

دور سہارن سے جانی و مالی قربانیاں پیش کرتی چلی آرہی تھی۔ چلئے ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اس تحریک کا قبلہ غلط تھا اور صحیح اسلامی اسپرٹ اس کے اندر موجود نہیں تھی لیکن صرف اس وجہ سے اسے تاریخ کے صفحات سے غائب کر دینا ایک اسلامی مورخ اور تذکرہ نویس کے اپنے اصول "انزلوا الناس منازلھم" کے خلاف ہے۔ تحریک خاکسار اگر اپنی بعض اعتقادی اور عملی گمراہیوں کے باوجود تاریخ دعوت و جہاد کے صفحات میں جگہ پا سکتی ہے تو مسلم لیگ کیوں نہیں پا سکتی؟ آخر اس کا قصور کیا ہے؟ بہرحال یہ کتاب بعض سہو و فروگذاشتوں کے باوجود اپنے موضوع پر بے مثال ہے۔ آپ تمام اصلاح پسند حلقوں کی جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس کتاب کو تحریک اسلامی کے لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافہ تصور کرتا ہوں۔

فقط والسلام

رفیق احمد رئیس احمد

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

ممتاز عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی سے ایک فکر انگیز انٹرویو

اسلام کو نافذ کرنا ہے تو سارے بت توڑنے ہونگے

مولانا مودودیؒ اور میں پٹھان کوٹ کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر کیا سوچتے تھے، کیا چیزیں ہمارے نزدیک اپنانے اور کیا ترک کرنے کی تھیں، یہ باتیں آج بتاؤں تو لوگوں کو اجنبی لگیں گی۔

مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی انقلاب کے جدید مفکرین میں نہایت نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ برصغیر میں احیائے اسلام کے لئے اٹھنے والی تحریک جماعت اسلامی کی زندگی کے ابتدائی ۲۰ برسوں میں داعی تحریک سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ اس دور میں دعوت اسلامی کے کارکنوں کی رہنمائی کے لئے بیش قیمت علمی و فکری کام انجام دیا۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار، تزکیہ نفس، حقیقت توحید، حقیقت شرک، اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، پاکستانی عورت دوراہے پر، یہ تمام تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔ مولانا کا اہم ترین علمی کارنامہ نو جلدوں پر مشتمل تدبر قرآن ہے۔ جس کی تحریر و تسوید کا کام ۲۳ برسوں میں مکمل ہوا۔ سوچ بچار اور غور و فکر کی مدت بھی اس میں شامل کرلی جائے تو یہ عرصہ ۵۵ سال کا بنتا ہے۔ یہ تفسیر بلاشبہ نئی نسل پر قرآن فہمی کے دروازے کھولنے والی دور حاضر کی چند تفاسیر میں سے ایک نہایت اہم تفسیر ہے اور قرآن کا ذوق عام کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہے جماعت اسلامی سے طریق کار پر بعض اختلافات کے باعث علیحدگی کے بعد مولانا اصلاحی عملاً گوشہ نشین ہو کر تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن پبلک پلیٹ فارم پر آنے سے دانستہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ برسوں کے بعد یہ ان کا پہلا انٹرویو ہے جس کے مضمون نے روزنامہ وفاق لاہور کے مدیر

جناب مصطفیٰ صادق کو حال ہی میں مرحمت فرمایا اور جسے تکبیر میں وفاق کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ادارہ تکبیر سے حیات نو میں منتقل کر رہے ہیں۔

جب تک دین کے نفاذ کا آغاز اپنی ذات اور اپنے گھر سے نہ کیا جائے اُسے معاشرے میں نافذ نہیں کیا جاسکتا

س:۔ مولانا کسی معاشرے میں اسلام کا نفاذ کس طرح ہونا چاہیے؟ ہمارے ملک میں اس وقت جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر اس مقصد کے لئے کام کہاں سے شروع کیا جائے آپ اس کے لئے کیا طریق کار تجویز کریں گے؟

ج:۔ اسلامی نظام کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں اللہ کا دین ہر شعبہ حیات پر غالب ہو جائے یہ چیز کلی تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس غیر معمولی تغیر کے لئے طریق کار کا تعین فی الواقع ضروری ہے۔

میرے نزدیک اسلام کے مطابق معاشرے کی اصلاح کسی جگہ بھی مقصود ہو اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے پر جو عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں موجود خرابیاں کس طرح پھیلتی اور کس طرح پھیلائی جاتی ہیں۔

نفاذ اسلام کے لئے سب سے پہلا ضروری کام یہی ہے۔ آج ہماری سوسائٹی پر جو عوامل سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں ان میں اخبارات، ریڈیو، ٹیلیویژن، دینی مدارس، جدید درسگاہیں، خانقاہیں سب شامل ہیں۔ اس دور میں سیاسی ادارے اور تنظیمیں اور جماعتیں بھی بہت سی برائیاں اور بھلائیاں پھیلانے کی ذمہ دار ہیں۔ ان سب کو متعین طور پر سامنے رکھ کر غور کرنا ہوگا کہ ان کی خوبیاں اور خرابیاں کیا ہیں؟ اس کے بعد ہمارے لئے ممکن ہوگا کہ ہم ان کی اصلاح کے لئے کوئی طریق کار وضع کریں۔

مثال کے طور پر دیکھئے، ہر شریف آدمی جب صبح کے وقت اخبار اٹھاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے۔ ایسے اخبارات کا چھاپنے کا اس کے سوا کوئی مقصد نظر نہیں آتا کہ برائیاں زیادہ سے زیادہ نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے لائی جائیں۔ اخبار کی اشاعت بڑھانے اور

اس سے اپنی تجوریاں بھرنے کے لئے جو گھٹیا مواد یہ اخبارات روزانہ پیش کرتے ہیں اور جس طرح قوم کے اخلاق کی بربادی کا باعث بنتے ہیں اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ مجھے بھی اس معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے یہ سب دیکھنا پڑتا ہے۔ ان اخبارات کا سرورق اس ڈر سے اپنے پاؤں کے نیچے رکھ لیتا ہوں کہ کوئی دیکھنے والا میری شرافت ہی کو مشکوک نہ سمجھنے لگے۔ یہ بات میں نے صدر ضیاء الحق صاحب سے بھی جب وہ میرے یہاں آئے تھے کہہ دی تھی۔

تعلیمی اداروں کو دیکھئے، یہ قوم کے عقائد و نظریات پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ "مقدس" ہمارے دینی مدارس۔ ان کا جائزہ لیجئے، کیا یہ مدارس اور انہی کی طرح "مقدس" ہمارے صوفیاء کی خانقاہیں، صرف خیر پھیلانے ہی کا کام کرتی ہیں؟ آپ جان لیں گے کہ اس امت میں فساد کے بیج یہیں بوئے جاتے ہیں۔ فرقہ پرستی، تنگ نظری، ذہنی غلامی، غور و تدبر اور تحقیق و اجتہاد سے عام بیزاری انہی کے ذریعے سے معاشرے میں پھیلتی ہے۔ اور ان کے اس کردار کی وجہ سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء سے متوحش ہوتا ہے۔

رہا جدید درسگاہوں کا معاملہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مغربی تہذیب کی خباثتوں کا اور والحادی نظریات کا سیلاب ہماری سوسائٹی میں یہیں سے آیا ہے۔ الحاد اور بے دینی کا منبع یہی درسگاہیں ہیں۔

قرآن و سنت کو قانون سازی کا اصل مأخذ تسلیم کر لیا جائے تو فقہی اختلافات نظام اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے

میں ان اداروں کے صرف منفی پہلوؤں کی طرف توجہ دلا رہا ہوں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ جب تک معاشرے پر اثر انداز ہونے والے یہ عوامل اپنی خرابیاں اسی طرح پھیلاتے رہیں گے اس وقت تک اصلاح معاشرہ اور نفاذ کا نام لیتے چلے جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، بلکہ الٹا نقصان ہی ہوگا۔ اصلاح کے یہی طریقے اگر جاری رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ لوگوں میں اسلام سے بیزاری پیدا ہوگی۔

جب تک ایک ایک چیز کی اصلاح نہیں ہوتی، اس وقت تک کسی اصلاح معاشرہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دینی مدارس، خانقاہوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، ریڈیو، ٹیلیویژن سب پر اسلام کو غالب کرنا ہوگا۔ ان سب کے قبلے درست کرنا ہوں گے۔ آپ اگر یہ نہیں کر سکتے تو

وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ریڈیو والے میرے پاس آئے وہ چاہتے تھے کہ میں انھیں اپنا درس ریکارڈ کرا دوں۔ انھوں نے کہا آپ ریڈیو پر درس دیتے رہے ہیں، یہ سلسلہ پھر شروع کیجئے۔ میں نے کہا آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو ریڈیو پر کبھی درس نہیں دیا۔ کہنے لگے ہمیں اوپر سے حکم ملا ہے کہ آپ سے درخواست کریں۔ اس پر میں نے ان سے کہا، آپ کے کچھ دوسرے بھائی بھی ایک روز آئے تھے، میں نے ان سے کہا اگر میں قرآن کا درس ریکارڈ کراؤں تو آپ اسے من و عن نشر کر سکیں گے جو کچھ میں کہوں گا آپ اس کی ذمہ داری اٹھا سکیں گے۔ ان میں سے دو نے اثبات میں سر ہلایا لیکن ان کے ایک بڑے نے کہا، مولانا، یہ تو ممکن نہ ہوگا ہم بہرحال اپنی پالیسی کے پابند ہیں۔ تب میں نے ان سے کہا، آپ شوق سے اپنی پالیسی کے پابند رہئے لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شخص پر اللہ، اس کے فرشتے اور تمام صالحین کی لعنت ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے قرآن کی پیروی کرنے کے بجائے آپ کی پالیسی کی پابندی کرے۔ مجھے معلوم ہے آپ لوگوں کے ہاں اصل کسوٹی قرآن و سنت نہیں، آپ کی پالیسی ہی ہے۔ آپ وہ بات نشر نہیں کر سکتے جو معاشرے میں قبول عام حاصل نہ کر سکے، جس سے حکومت کی سیاسی مصلحتیں مجروح ہوتی ہوں۔ میں اگر درس دوں گا تو مجھے قرآن و حدیث ہی کا منشا واضح کرنا ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ

اصلاح معاشرہ کے لئے ذرائع ابلاغ اور نظام تعلیم کے قبلے کی درستگی نہایت ضروری ہے

میں کلام الٰہی کی شرح میں اپنی طرف سے کچھ کہوں، قرآن کے مدعا میں کوئی تبدیلی کر دوں، جو کچھ قرآن کا مطلب ہے وہ نہ کہوں۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ میں آپ کی پسند ناپسند کا پیرو نہیں ہوں، قرآن و حدیث کا متبع ہوں۔ آپ اپنی پالیسی کی اتباع کیجئے، میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں اللہ کی کتاب کے ساتھ یہ سلوک کروں۔

یہ واقعہ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لئے سنایا ہے کہ جب تک ہر پالیسی قرآن و حدیث کے تابع نہ ہو جائے گی، اس وقت تک آپ اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔ نفاذ اسلام کے لئے سب سے پہلے شرط یہی ہے کہ آپ میں اس کے لئے غیر متزلزل عزم و ارادہ پیدا ہو اور آپ اس کے لئے ساری دنیا

سے الجھ جانے کے لئے تیار ہو۔

س: مولانا، اس سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کی اہلیت رکھنے والے لوگ نہیں ملتے۔

ج: دیکھئے، میں نے اس سوال کے جواب میں جو بات صدر صاحب سے کہی تھی، وہی آپ سے بھی کہتا ہوں۔

مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس کام کی اہلیت رکھنے والے لوگ بہت کم ہیں لیکن وہ اتنے کم بھی نہیں ہیں کہ کام کی ابتدا ہی نہ کی جا سکے۔ ہاں البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ کام کرنے کے لئے عزم و ارادہ رکھتے ہوں اور آپ میں مردم شناسی کی صلاحیت ہو۔ ہماری تاریخ میں اس کی بہترین مثال عمر بن عبد العزیز ہیں۔ وہ اتنے بڑے آدمی نہیں تھے جتنے بڑے آدمی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے مگر ان میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک یہ کہ جس کام کو کرنے کے لئے اٹھتے تھے اس میں ان کا عزم غیر متزلزل تھا، وہ اس کے لئے پہاڑوں سے لڑ جانے کے لئے تیار اور دوسرے یہ کہ ان میں مردم شناسی تھی، ان کے معاشرے میں جتنے بھی کام کے آدمی تھے انھوں نے انھیں پکڑا اور کام پر لگا دیا۔ ان لوگوں کو حاصل کرنے میں ان کو اسی وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ان کے اقدامات اور رویوں کو دیکھ کر ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ارادے میں مخلص ہیں اور اپنی جان دے کر بھی اس کام کو کرنے کا عزم رکھتے ہیں، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ان کی بیوی بھی ایک ہی رات میں ان کے عزم و ارادہ کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔ وہ جس دین کو نافذ کرنا چاہتے تھے وہ سب سے پہلے ان کی ذات اور ان کے گھر پر نافذ ہوا۔ پھر معاشرے میں ان کے نفاذ سے انھیں دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکی۔

عام مسلمان صحیح بات سنتے ہیں۔ سارا تعصب مذہبی فرقوں کی قیادت میں ہے

س: اس کام کے راستے کی ایک رکاوٹ فقہی اختلافات بھی ہیں، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: یہ کوئی رکاوٹ نہیں۔ رکاوٹ آپ کا طریق کار ہے۔ آپ مان لیجئے کہ اسلام میں اصل ماخذ کی حیثیت صرف قرآن و سنت کو حاصل ہے۔ آپ تسلیم کیجئے کہ ہمارے امام صرف ابو حنیفہ

رحمۃ اللہ علیہ ہی نہیں سب ائمہ ہمارے ہیں۔ ان سب کی فقہ ہمارا ورثہ ہے۔ ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی تعصب نہیں رکھتے ان میں سے جس کی جو بات قرآن و سنت کے زیادہ مطابق ہو گی، ہم اسے زیادہ قبول کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مسئلہ میں احناف کی رائے زیادہ مضبوط ہو اور کسی دوسرے مسئلہ میں شوافع کا نقطہ نظر وفق بالکتاب والسنۃ ہو۔ ہمیں پیروی بہر حال قرآن و سنت کی کرنی ہے، جس کی بات ان کے زیادہ قریب ہو گی ہم اسے ہی اختیار کریں گے اسلام کی شرح و تفسیر اور قانون سازی کے لئے وہی لوگ آگے بڑھیں جو اس اصول کو تسلیم کرتے ہوں۔ پیدائشی حنفی اور پیدائشی اہل حدیث حضرات کی اسلامی ریاست کے نظام کی تشکیل میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس اصول کو مان کر جو اہل علم رائے دیں ان کی اکثریت کا فیصلہ آپ ملک میں نافذ کریں اور دوسروں کو اجازت دیں کہ وہ اگر اسے غلط سمجھتے ہوں تو علمی دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کرتے رہیں یہاں تک کہ اکثریت ان کے نقطۂ نظر کو قائل ہو جائے نفاذ اسلام کا صحیح طریقہ یہی ہے۔

یہ طریقہ آپ اختیار کیجئے، پھر دیکھئے یہ اختلافات کس طرح ختم ہوتے ہیں اور اس کام کے لئے کیسے کیسے لوگ آپ کو اسی سوسائٹی سے ملتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ آپ کا ارادہ مضبوط ہو آپ صرف حق کے ساتھی ہوں۔ شرک و بدعت اور معصیت و ضلالت کو باقی رکھ کر اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی کر کے آپ اس نظام کو نافذ نہیں کر سکتے۔ یہ تصوف کے ادارے اور یہ خانقاہیں اور یہ جامد مذہبیت، آپ کو ان سب کو قرآن و سنت کا تابع بنانا ہو گا۔ آپ اسلام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو سارے بت توڑنے ہوں گے آپ ہی

اخبارات کے سرورق میں اس ڈوبتے ہوئے اپنے پاؤں کے نیچے رکھ لیتا ہوں کہ کہیں دیکھنے والا میری شرافت ہی کو مشکوک نہ سمجھنے لگے

کھینے گے تاکہ اگر سب بت ٹوٹ گئے تو باقی کیا رہ جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ باقی اللہ کا دین رہ جائے گا اور اسے ہی باقی رہنا چاہئے۔

یہ کام البتہ دلیل و برہان کے ہتھیاروں سے کرنا چاہئے، لوگوں کو اپنی بات کا قائل کیجئے، آپ اطمینان رکھئے صحیح علم کے سامنے جہالت کبھی نہیں ٹھہر سکتی۔

س: مولانا، حدود الٰہی کیا اصلاح معاشرہ کے بعد نافذ کی جائیں یا دونوں کام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں؟

ج: جو کام شروع ہو چکا ہے، اسے روکئے، لیکن جو باتیں اصلاح معاشرہ اور تدوین فقہ کے سلسلہ میں میں نے عرض کی ہیں ان کی اہمیت بنیادی ہیں ان کا اہتمام بہر حال ہونا چاہئے۔ ان کے بغیر حدود اللہ کا نفاذ اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا سارا کام غیر موثر رہے گا۔ مخلوط تعلیم کو باقی رکھ کر آپ بدکاری کی سزا نافذ کریں گے تو ہمارے نوجوان یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای | باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

منفی عوامل کو ختم کیجئے، دین کی دعوت مثبت طور پر معاشرہ کے سامنے پیش کیجئے، پڑھے لکھے لوگوں کو دلیل کے ساتھ اپنی بات سمجھائیے، آپ دیکھیں گے کہ معاشرہ بتدریج تبدیل ہو جائے گا۔

س: مولانا مذہبی فرقوں میں جو تعصب ہے، اس کا کیا علاج ہے؟

ج: اس کا علاج یہی ہے کہ حکومت پوری قوت کے ساتھ اس نقطۂ نظر کو پیش کرے جس کی وضاحت میں نے کی ہے۔ وہ کہے کہ دین صرف قرآن و سنت کا نام ہے جو شخص کوئی رائے رکھتا ہے وہ دلیل کے ساتھ اپنی بات پیش کرے، ہم صرف قرآن و سنت پر مبنی نظام نافذ کریں گے۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ یہ لوگ یہ کام نہیں کر سکتے۔ یہ تو اسلام کی شرح و وضاحت کے لئے لوگوں کا انتخاب کرتے وقت یہ دیکھتے ہیں کہ دو اگر دیوبندی ہیں تو تین بریلوی بھی ہونے چاہئیں ان کے نزدیک اصل معیار قرآن و سنت کا علم نہیں ہے، فرقوں کی سند ہے۔ آپ یقین کریں عام مسلمان صحیح بات سنتے ہیں۔ سارا تعصب ان فرقوں کی قیادت میں ہے۔ حالات میں بڑی تبدیلی آئی ہے جو باتیں پاکستان بنتے وقت پبلک جلسوں اور عام اجتماعات میں نہیں کہی جا سکتی تھیں وہ اب کہی جا سکتی ہیں۔ اور لوگ سنتے ہیں۔ دلیل اور شائستگی کے ساتھ بات کی جائے تو لوگوں میں اس کی قبولیت کا جذبہ ہے۔ ان میں بیداری موجود ہے، حکومت اگر صحیح بات کی پشت پناہی کرے گی تو لوگ بہت آسانی کے ساتھ اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ علم صحیح کے مقابلے میں جہالت اور تعصب کبھی ٹھہر نہیں سکتے۔

س: دینی سیاسی جماعتوں کی اصلاح کیسے کی جائے۔

ج: یہ جماعتیں فی الواقع بہت بگڑ چکی ہیں۔ ان کا منصب لوگوں کو دین بتانا اور اسے معاشرے میں غالب کرنے کی جدوجہد کرنا تھا۔ لیکن ان کی قیادت اس حد تک پستی میں گر چکی ہے کہ ان کے نزدیک اب سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کون سا نعرہ اور کون سی بات عام لوگوں کو متوجہ کر سکتی ہے۔

صحیح علم کے مقابلے میں جہالت کبھی نہیں ٹھہر سکتی
بات دلیل و شائستگی کے ساتھ پیش کیجائے تو لوگ آج بھی قبول کرتے ہیں

میں جماعت اسلامی کو اپنی جماعت کہتا ہوں۔ میں سترہ سال اس کے ساتھ رہا ہوں، آج بھی میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ ان کی فتح کو میں اپنی فتح اور ان کی شکست کو اپنی شکست سمجھتا ہوں۔ میں اگر آج انہیں بتاؤں کہ میں اور مولانا مودودی پٹھان کوٹ کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر کیا سوچتے تھے۔ کیا چیزیں ہمارے نزدیک اپنانے کی تھیں اور کیا ترک کرنے کی تھیں۔ ہم نے کن اصولوں پر جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم معاشرے کو کیا کہنا چاہتے تھے۔ اور کس لب و لہجے میں کہنا چاہتے تھے، تو انہیں یہ باتیں اجنبی لگیں گی۔ ان کا مسلک بھی اب یہی ہے کہ تم ہمارا بت پوجو ہم تمہارا بت پوجنے کے لئے تیار ہیں۔ یہی ایک جماعت تھی جس سے آپ احقاق حق اور ابطال باطل کی توقع کر سکتے تھے، اور اب بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں۔

آپ اگر ان کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے یہ حقائق ان کے سامنے رکھیے۔ انہیں ان کی ذمہ داریوں پر توجہ دلائیے۔ انہیں بتائیے کہ شہادت حق کے منصب کے تقاضے کیا ہیں، اصلاح کا طریقہ ہمیشہ دعوت ہی رہا ہے، اس دعوت کے مخاطب عوام بھی ہیں اور دینی اور سیاسی جماعتیں بھی۔

س: اسلامی ریاست میں منکر کی اشاعت ممنوع ہے۔ ہمارے ملک میں بعض سیاسی جماعتیں کھلم کھلا یہ کام کرتی ہیں۔ ان پر کیا پابندی لگائی جا سکتی ہے؟

ج: جو منکرات ہمارے معاشرے میں صدیوں سے پھیلے ہوئے ہیں جنہیں اب نئی نسلیں معروف سمجھنے لگی ہیں ان کو مٹانے کے لئے حکیمانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ طے ہے کہ انہیں بہر حال مٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ یہ اگر مٹانے کا عزم ہو تو مٹایا جا سکتا ہے۔ پہلے آپ ترجیحات

متعین کر لیجئے۔ واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ کس چیز کو مقدم کرنا ہے اور کس چیز کو مؤخر کرنا ہے۔ مناظرانہ طریقہ نہیں، سائنٹیفک استدلال کے ساتھ اپنی بات پیش کیجئے۔ قانون کے ذریعے ختم کرنا آخری تدبیر ہوتی ہے۔ اصلاح کے سارے طریقے آزمانے کے بعد اسے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

س: مولانا شیعہ حضرات کے بارے میں؟

ج: مسلمان معاشرہ اس وقت صحیح خطوط پر استوار نہیں ہے۔ اس میں ہر بدعت و ضلالت اور کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والے مسلمانوں میں شامل ہیں۔ جب تک یہ صورت حال ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم انھیں مسلمان ہی سمجھیں۔ شیعہ ان مسلمانوں کا حصہ ہیں تاہم یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ شیعیت اسلام کی کوئی صحیح تعبیر نہیں ہے۔

س: اگر کوئی ادارہ یا جماعت صریح نصوص کے خلاف کام کرتی ہے تو حکومت کیا اسے روکے گی؟

ج: یقیناً روکے گی۔ لیکن روکنے کا طریقہ ایک ہی نہیں ہوتا۔ آپ اس کے لئے ذرائع ابلاغ سے کام لے سکتے ہیں۔ قلم کے ذریعہ اس کی لغویت واضح کر سکتے ہیں۔ دلائل کے ساتھ اس کا تار و پود بکھیر سکتے ہیں۔ آخری درجے میں قانون کی طاقت سے بھی کام لیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی دین کی شرائط و حدود کا لحاظ ضروری ہے۔ میں آپ کے سامنے خوارج کی مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ انارکی کے علمبردار تھے۔ ان کا ظہور خلافت راشدہ کے زمانے میں ہوا۔ علانیہ حکومت کے خلاف کام کرتے تھے۔ خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں یہ سب ہوتا رہا لیکن آپ نے

> حکومت کی تنظیم معمولی نہیں ہوتی، وہ اگر چاہے تو مخالف عناصر کی تمام تر کوششوں کے باوجود نفاذ اسلام کیلئے نتیجہ خیز اقدامات کر سکتی ہے

لوگوں کے پوچھنے پر یہی کہا کہ جب تک وہ زبان سے اپنی بات کہتے ہیں ہم بھی زبان سے ہی ان کی تردید کرتے رہیں گے۔ وہ اگر ہاتھ اٹھائیں گے تو ہم بھی ہاتھ اٹھائیں گے۔ میرے نزدیک اس طرح کے معاملات میں یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

س: بعض دینی جماعتیں اور گروہ اپنی سیاسی اغراض کی وجہ سے حکومت کے ساتھ تعاون سے گریز کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اگر اپوزیشن کا کردار چھوڑ کر حکومت کا ساتھ دیا

یہ سیاسی طور پر اس کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ ان کے مقابلے میں اسلام دشمن طاقتیں پوری طرح منظم ہیں، اس صورت حال میں آپ کیا فرمائیں گے؟

ج: اصل مسئلہ یہ ہے کہ حکومت کیا فی الواقع اپنے ارادوں میں مخلص ہے۔ وہ اگر اخلاص کے ساتھ اس کام کا عزم کرے گی اور اس کی تکمیل کے لئے ڈٹ جائے گی، تو اسے یقیناً تعاون حاصل ہوگا۔

بات یہ ہے کہ سب اپنی ego (انا) کے اسیر ہیں۔ حکومت بھی اور سیاستدان بھی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سب کو دین و ملت کے مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔ حکومت اگر مصمم ارادے اور خلوص نیت سے قدم اٹھائے گی، تو تعاون ملے گا۔ بعض اوقات بے شک یہ ہوتا ہے کہ تعاون نہیں ملتا، لوگ خواہ مخواہ الگ رہتے ہیں، الگ ہی نہیں رہتے مخالفت بھی کرتے ہیں۔ لیکن حکومت اگر اپنے اقدامات سے ثابت کر دے کہ وہ اسلام کے لئے مخلص ہے اس کے ہر حکم کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہے تو پھر کوئی نالائق ہی تعاون سے گریز کرے گا اور اس طرح کے لوگوں کے تعاون نہ کرنے ہی میں خیر ہے۔

آپ کو معلوم ہے میں نے کبھی حکومت کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھے اس بات پر اطمینان نہیں ہے کہ وہ فی الواقع یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آج اس کام کا عزم کریں اور ثابت کریں کہ وہ سنجیدہ ہیں، میں ضرور ساتھ دوں گا۔ کون مسلمان ہے جو دین کے نفاذ میں ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ کام کرنے کا عزم ہو تو اچھے لوگ بہت ملیں گے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مخالف منظم ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے میں نہیں سمجھ سکا کہ مخالفوں سے آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ میرے خیال میں تو مخالف عناصر سب سے زیادہ منتشر ہیں۔ حکومت کی اپنی تنظیم معمولی نہیں ہوتی۔ وہ اگر کام کرنا چاہتے تو ان عناصر سے مقابلہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ہمارے سیاستدانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دو دن کی لیپا اور تیغی تگی رونے ہی کو سیاست سمجھتے ہیں۔

اصلاح کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لئے اخبارات کو راہ راست دکھانا ہوگی مولویو

کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ یہ کام بڑے جہاد کا متقاضی ہے، اسے اگر کیا جائے تو یقیناً نتیجہ نکلتا ہے اور نکلے گا بات البتہ دلیل سے کرنا ہوگی۔ عمل اور استقامت کے ذریعے یہ بازی سر ہوگی۔ انقلاب معمولی چیز نہیں ہوتی اس کے ماننے والوں کو نتائج سے بے پرواہ ہوکر کام کرنا پڑتا ہے۔ میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ صحیح راستے پر چلتے ہوئے ناکام ہوکر مر جانا، غلط راستے پر کامیابی کے ساتھ زندگی گزارنے سے ہزاروں درجے بہتر ہے جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں ان کا عقیدہ یہی ہونا چاہئے۔

س: سیاسی اتحاد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: سیاسی اتحاد بھی کرنا پڑتے ہیں اصل ضرورت ترجیحات کے تعین کی ہے۔ یہ سب تدابیر ہیں پہلے یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ کیا کام کرنا ہے؟ اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا ہے؟ سیاسی گروہ اسی قوم کا حصہ ہیں، بے نظیر بھی ہمارے ہی معاشرے میں پیدا ہوئی ہیں۔ یہاں وہ عوامل موجود تھے جنھوں نے انھیں پیدا کیا۔ درپیش صورت حال میں ان سے بھی معاملہ کرنا ہوگا ان کے حقوق کا بھی بہرحال احترام کیا جائے گا اور کرنا چاہئے۔ یہ سب مسائل عملی تدابیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کام پہلے طے ہونا چاہئے، اس کی ترجیحات متعین ہونا چاہئے۔ یہ اگر ہوجائے تو ہر اقدام کی حکمت عملی خود بخود واضح ہوجائے گی۔

س: مولانا ہمارے لئے آپ کیا نصیحت کریں گے؟

ج: میں آپ کے سامنے اپنے ہی عمل کا نمونہ رکھوں گا۔ صحیح بات اختیار کیجئے صحیح بات کہئے میں آج بھی جب اپنی پرانی تحریریں پڑھتا ہوں تو مجھے اطمینان ہوتا ہے کہ میں نے حق کا ساتھ دیا حق کی وضاحت کی اور حق کو غالب کرنے کی سعی کی۔ آپ بھی یہی کیجئے، بندۂ مومن کیلئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

(بقیہ اسلامی تاریخ میں فن تعلیم کے ارتقائی مراحل)

نصاب جیسا ہوتا تھا جس کی تمام اساتذہ پابندی کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا کسی متعین درسگاہ یا ادارے کے بجائے کسی مشہور عالم کی طرف اپنا انتساب زیادہ پسند کرتے تھے۔

اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ "المدرسہ" (مدارس نظامیہ) میں دینی علوم اور زبان و ادب کے اسالیب پر خاص توجہ تھی، فلسفہ کا بالکل وجود نہیں تھا جبکہ اس کے برعکس "دارالعلم" میں پڑھائے جانے والے تمام فنون فلسفے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اظہار اثر عمری، دہلی

شاہ ولی اللہ احیائے نظام اسلامی کے علمبردار

سرسید مرحوم نے کسی موقع پر کہا تھا کہ "کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے۔"

آج ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر لکھنے جارہے ہیں۔ بظاہر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کسی شخصیت پر زور قلم صرف کرنے سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب مختصر وہی ہوگا جو سرسید مرحوم کے جملے سے سمجھ میں آرہا ہے۔

دراصل تاریخ کا موضوع نسبتاً دوسرے موضوعات کے خشک ہے مگر اتنا ہی اہم بھی ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے پیش نظر اس نظریہ کا ہونا لازمی ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ کن اسباب کی بنا پر سلف نے ترقی کی جس کو اپنا کر ہم بھی ترقی کرسکتے ہیں اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے انھیں تنزل کا شکار ہونا پڑا۔ تاریخ پڑھائی جاتی ہے اسی لئے کہ افراد اور قوموں کے نشیب و فراز کو دیکھ کر آدمی اپنا مستقبل پائیدار بنیادوں پر تعمیر کرے۔

نادان ہیں وہ لوگ جو "پدرم سلطان بود" کے نظریہ کے تحت تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جنھیں نقائص نظر ہی نہیں آتے ہیں کیونکہ نقص کا تصور "پدرم سلطان بود" کے فخر کے لئے ایک لطیف ضرب ہے جس سے ان کا آئینۂ فخر چور چور ہوجاتا ہے۔

کسی بڑی شخصیت پر لکھنا دراصل ایک عہد کی تاریخ مرتب کرنے کے برابر ہے کیونکہ ایسی شخصیتیں عہد کہن ساز کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرتی ہیں جن کی پائدار عمارت صدیوں کھڑی رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ ایک فرد نہیں ایک جہان تھے اور اپنے عظیم کارناموں کی بدولت جہانگیر ثابت ہوئے اور شاہ ولی اللہ متفقہ طور پر اٹھارویں صدی کے ایک عظیم مصلح اور مجدد ہیں۔

تجدید اور مجدد

"مجدد" کے ذکر پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختصر تشریح ہو جائے۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے "ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" اس حدیث کے تعیین مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے، کسی نے "مائۃ سنۃ" سے صدی مراد لیا اور "رأس" سے صدی کی ابتدا، اور سمجھا کہ ہر صدی کے آغاز میں ایک شخص پیدا ہوگا اور وہ دین کی تجدید کرے گا۔ چنانچہ اس مفہوم کے مطابق ہر صدی کی ابتدا یا انتہا میں "مجدد" کی کھوج شروع ہوئی اور اگر کوئی شخص نظر نہ آیا تو کسی شخص کو بشکل کھینچ تان کر لا کھڑا کیا تاکہ حدیث ان کے زعم میں صحیح ثابت ہو جائے۔

حالانکہ اس حدیث کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کوئی صدی ایسی نہیں گزرے گی جس میں کسی نے دین کی تجدید نہ کی ہو، اس مفہوم کے لئے عربی لغت میں وسعت ہے، اسی سلسلہ میں امام العصر مودودی لکھتے ہیں:

"ضروری نہیں کہ ایک صدی کا مجدد صرف ایک ہی شخص ہو، ایک صدی میں متعدد اشخاص اور گروہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک ہی "مجدد" ہو، ایک وقت میں بہت سے ملکوں میں بہت سے آدمی تجدید دین کے لئے سعی کرنے والے ہو سکتے ہیں۔" (۱)

اس کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ان تمام احادیث کے ذکر کے بعد جن میں تجدید کا ذکر آیا ہے لکھا ہے:

"یہ تمام حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت کے اندر صالحین و مصلحین اور دین حق پر قائم رکھنے والوں، اور لوگوں کے پیدا کئے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرنے والوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہیگا، مجددین و مصلحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر "من یجدد لھا دینھا" والی حدیث میں آیا ہے لیکن چونکہ اس حدیث میں "مائۃ" کا لفظ آیا ہے جو "سو" اور "صدی" دونوں معنوں کے لئے آتا ہے نیز "من" کا لفظ آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لئے عموماً لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی اکثر لوگوں نے "مائۃ" کو صدی اور "من" کو واحد کے مفہوم میں لیا اور سمجھے کہ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ کسی خاص شخص کو بھیجتا ہے جو اس صدی کا "مجدد"

بنکر آتا ہے حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے جو اس میں خدا کے دین کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔" (۲)

اس طرح کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر سو سال کے بعد ہی ایک ہی "مجدد" پیدا ہو بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے دین کی تجدید کرنے کی ضرورت پیش آئی اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو یا افراد کو پیدا کر دیتا ہے جو دین کی تجدید کرتے ہیں۔

بعد علماء نے "مجددین" کا تجزیہ بھی کیا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ سارے مجددین ایک ہی پایہ کے نہیں ہوتے مگر مجددین کے مابین فرق مراتب کا تعیین ہمارا حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کا ذمہ دار ہے گرچہ کسی نے اس کا تعیین نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ ہر مجدد کے دور کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور کار تجدید کی نوعیت میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور تجدید کے طریقہ اور وسائل بھی مختلف ہوا کرتے ہیں مثلاً کوئی صرف قلم و زبان کے ذریعہ افکار و خیالات کی تجدید کرتا ہے اور ایک ایسا فکری انقلاب برپا کر جاتا ہے جس کا اثر صدیوں قائم رہتا ہے اور کوئی بیک وقت سیف و قلم کا حامل ہوتا ہے اور ان دونوں کے ذریعہ اسلام کو باطل کی آمیزش سے پاک صاف کرتا ہے، اس کی مثال خود شاہ ولی اللہؒ کی ذات گرامی ہے کہ انھوں نے اپنی ساری عمر قلم و زبان کے ذریعہ دین کو باطل خیالات و نظریات کے چنگل سے چھڑانے میں صرف کی، اور امام ابن تیمیہ نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا اس میں قلم کے ساتھ تلوار بھی تھی جس کو انھوں نے تاتاریوں کے خلاف بے نیام کیا تھا۔

امت محمدیہ پر تجدید دین کا شرف

اسلام درحقیقت خدا کی طرف سے نازل کردہ ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے قوانین پر مشتمل ہے اور یہ دین، صرف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین نہیں ہے بلکہ یہ وہی دین ہے جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور اس کی تکمیل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر انجام پائی۔ قرآن کہتا ہے "ان الدین عند اللہ الاسلام" اور "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" مگر رسول اللہ کے بعد یہودیت و نصرانیت نے زور پکڑنا شروع کیا اور علمی دنیا میں اس کا مقابلہ اسلام اور غیر اسلام سے ہونے لگا اور مسلم علماء نے اس کا دفاع کرنا بھی شروع کیا تو اس کے بعد یہ تصور عام ہوا کہ "اسلام وہ ہے" جس کو نبی آخر الزماں محمد صلعم نے پیش کیا

اس تصور کے عام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ اللہ کے آخری فرستادہ ہیں اور آپ ہی پر اس دین اسلام کی تکمیل ہوئی اور آپ کے بعد کوئی نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے، اس بنیاد پر بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین آپ کا لایا ہوا دین ہے اور اسلام سے مراد یہی شریعت محمدی ہے اور عیسوی اور موسوی شریعت کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔

نبی امی علیہ السلام تک اسلام کی تجدید انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ ہوتی رہی اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی رسولوں ہی پر تھی مگر نبی امی کے بعد جس طرح دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری آپ کی امت پر ڈالی گئی "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتؤمنون باللہ" (۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تجدید و احیاء کا عظیم کام بھی اسی امت کے افراد سے لیا ہے اور لے رہا ہے اور تا قیامت لیتا رہے گا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا ہے اور اس کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی بھی قسم کی تحریف و تنسیخ سے محفوظ فرما رہا ہے، یہی وہ ایک کسوٹی ہے جس پر "مجددین" دین کو کس کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں، چنانچہ یہی ہوتا آ رہا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا، اسلام کسی دور میں بھی بالکلیہ باطل کے ساتھ مخلوط نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔" (۲)

"دعوت اسلامی کا تسلسل" اس عنوان کے تحت مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں،

"لیکن واضح رہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہا ہے مسلمانوں نے راہ راست سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا کتاب و سنت سے مقابلہ کر کے اس کا علم اور احساس ہو جاتا تھا، دین و شریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے مطالعہ سے غیر اسلامی ماحول، مشرکانہ اور جاہلانہ اعمال و رسوم اور جاہلی اخلاق و عادات کے خلاف نیز طبقۂ امراء اور گروہ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبہ جہاد پیدا ہوتا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں ایسے عالی ہمت اور اولو العزم اشخاص پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس امت میں انبیاء کی جانشینی کا حق ادا کیا، مسلمانوں کے تن مردہ میں روح پھونکی اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت و تموج پیدا کیا اور مسائل و علوم میں اپنی فکر تازہ اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی روح اور نئی بیداری پیدا کی۔" (۳)

کئی صدیوں بعد ہندوستان "تجدید و احیائے دین" کا مرکز بنا اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

مجددین میں ایک سربرآوردہ شخصیت ہیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اب ہم مختصر طور پر ہندوستان میں اسلام کی آمد کا تاریخی جائزہ لیں گے۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

مورخین کی رائے یہ ہے کہ عہد خلافت میں اسلام کی روشنی اس ملک میں پہنچی اور پھیلنی شروع ہوئی۔ بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق عہد رسالت ہی میں یہاں اسلام کی آمد شروع ہو چکی تھی چنانچہ بعض مورخین نے "شق قمر" کے واقعہ کے تحت لکھا ہے کہ ہندوستان کا معاصر بادشاہ چاند کو دو ٹکڑوں میں ادھر ادھر جاتا دیکھ کر اسلام قبول کیا تھا ان کے علاوہ دوسرے بعض تاریخ نگاروں نے ثابت کیا ہے کہ بعثت نبوی سے قبل ہی عرب و ہند کے تعلقات قائم تھے اور ان کے درمیان تجارتی آمد و رفت بھی تھی اس سلسلے میں بعض روایات کا بھی سہارا لیا ہے۔ (۴) بہر صورت ان آراء سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام بہت جلد ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں۔

"ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا سب سے پہلا اور قدیم سبب عرب اور ہندوؤں کا تجارتی میل جول تھا، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے مشرکوں میں باہم تعلق نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھا بلکہ اس کا آغاز اسلام سے بہت پہلے ہو چکا تھا ...... بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہی سب سے بڑی دولت اور اپنی سب سے قیمتی متاع جو عرب میں پیغمبروں کے وسیلے سے ان کو ملی تھی وہ بھی رفتہ رفتہ اپنے ساتھ لانے لگے۔" (۵)

عہد خلافت اور اس کے بعد جب باقاعدہ فتوحات کا دور شروع ہوا اور سندھ پر محمد بن قاسم نے حملہ کیا اور وہاں مسلمان رہنے لگے تو اسلام کے اثرات بھی پھیلنے شروع ہوئے، محمد بن قاسم ایک ایک شہر فتح کرتا جاتا تھا اور نقباء اسلام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے جاتے تھے۔ محمد بن قاسم نے عام اعلان کر دیا تھا کہ جو چاہے اسلام قبول کر کے ہمارا بھائی بن جائے اور ہمارے برابر حقوق حاصل کرے۔ اور جو چاہے اپنے کیش و مذہب پر قائم رہ کر اطاعت گزاری اختیار کرے۔ (۶) ادھر مالابار کے راستوں سے تاجروں کے ذریعہ سے اسلام پہنچا اور بہت حد تک اسلام کی صحیح تبلیغ انہی تاجروں کے ذریعہ ہوئی کیونکہ مسلمان فاتحین نے جب ہندوستان کو فتح کیا تو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے بجائے انکے

جیش نظر ملک گیری اور ملک ستانی تھی اور یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی کہ مسلمان فاتحین نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی ہو، گرچہ فاتحین مسلمان تھے اور ان کا مذہب اسلام تھا مگر انھوں نے اس کو اصلی شکل میں پیش نہیں کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اپنا اثر ڈالنے کے بجائے الٹا ہندوؤں سے متاثر ہو گیا۔ "تمدن ہند" کا مصنف لکھتا ہے:

"ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب کی مٹی بری طرح پلید ہوئی ہے۔"(٧) نیز لکھتا ہے:

"اگر ہندوستان میں دین محمدیؐ نے کچھ اثر چھوڑا ہے اور یہاں کے مذہب اور عقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے۔"(٨)

یہی وجہ ہے کہ اکبر کے زمانے میں ایک نئے "دین" کی بنیاد پڑی اور تمام ادیان کا مخلوط ہندوستانی ایڈیشن "دین الٰہی" کا نام دے کر تیار کیا گیا، شاید یہی کچھ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کو لکھنا پڑا کہ

"بد قسمتی سے ہندوستان میں اسلام ایران و افغانستان کا چکر کاٹ کر پہنچا اور راستہ میں اپنی بہت سی تازگی اور زندگی کھو کر یہاں کا اسلام "سکنڈ ہینڈ" تھا۔"(٩)

گویا ہندوستان تک اسلامی تعلیمات اپنے حقیقی رنگ میں نہیں پہنچ سکیں مگر یہ حالات دیر تک باقی نہ رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہو یعنی قرآن مجید وہ تو اپنی اصلی شکل میں قیامت تک باقی رہے گا، اور یہی اسلامی تعلیمات کا مبدا و منبع ہے چنانچہ قرآن اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی اشاعت ہندوستان میں عام ہونا شروع ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے بندوں کو پیدا فرمایا جنھوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں ہندوستان کے سکنڈ ہینڈ اسلام کو اوور ہال (Overhaul) کیا اور اس کی حقیقی شکل و صورت میں اہل ہند کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی اس کے باوجود اسلام اس ملک میں وہ کردار ادا نہ کر سکا جو دوسرے مفتوحہ ممالک میں ادا کیا۔ اس کے کئی اسباب میں ایک سبب یہاں مسلمانوں کا غیر مسلم سماج کے ساتھ معاشرتی میل جول اور نو مسلم خاندانوں سے اپنی پرانی طرز معاشرت کا بالکلیہ خاتمہ نہ ہونا۔ اس کے علاوہ ذہنوں پر سنیاسیوں اور جوگیوں کے باطل فلسفوں کی چھاپ بھی شامل ہے۔

مولانا مسعود عالم ندویؒ رقمطراز ہیں:

"گو اس دیش پر ہزاروں احسان ہیں اور اس کی روشن تعلیمات کے اثر سے یہاں کے مذاہب میں تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئیں لیکن تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا بھی موثر ہو سکا اس سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور یہاں مسلمانوں کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور یہ پیچ و میل ہندو آتی تہذیب اور معجون مرکب مذہب عوام تو عوام علماء اور صوفیوں کے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھا گیا کہ حضرت مجدد سرہندی (٩٧١-١٠٣٤ھ) سے لے کر آج تک تین سو سال سے کچھ اوپر کی مسلسل اصلاحی کوششوں کے بعد بھی یہ صدیوں کا بیٹھا ہوا رنگ دور نہیں ہو سکا ہے اور اللہ جانتا ہے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے سچے دین کی اصل تعلیمات یہاں اپنے سادہ اور اصلی رنگ میں کبھی جلوہ گر ہو بھی سکیں گی یا نہیں۔"(١٠)

شاہ ولی اللہ سے پہلے کی سلطنت اور مسلمانوں کی حالت:

شاہ ولی اللہ سے پہلے سلطنت مغلیہ کا تاجدار اورنگ زیب تخت نشین تھا، اورنگ زیب نہ صرف ملک کا حکمراں تھا بلکہ باطل شکن مجاہد تھا، سلطنت مغلیہ کا ایک مشہور فرمانروا "اکبر" جب دنیائے وقت مولویوں کے دھوکہ میں آکر ایک نئے دین کی بنیاد رکھی اور دین محمدیؐ کو یکسر رد کر دیا کہ اس دین کا سورج طلوع ہوئے ایک ہزار برس کا عرصہ گذر چکا ہے اور اس وقت ایک نئے دین کی ضرورت ہے اور اس دین کو "دین الٰہی" نام دے کر ایک معجون تیار کیا اور اس وقت کے علماء سو نے اس کا پرچار شروع کیا اور اس دین کے داعی اور مبلغ بن گئے، اگرچہ اس کا یہ دین اپنے گھر میں اپنی موت مر گیا لیکن یہ کون جانتا تھا کہ اس نسل میں ایک حکمراں ایسا بھی پیدا ہوگا جو اکبر کے دین الٰہی کو دور کر کے "دین محمدیؐ" کو قائم کرنے کی کوشش کرے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا، اورنگ زیب ایک خدا پرست، متقی اور پرہیزگار انسان تھا، سنت کا دلدادہ تھا، تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بالمقابل اس کا بھائی دارا شکوہ تھا جو اپنے پردادا "اکبر" کے نظریات کا حامل تھا۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی آپس میں کشمکش دراصل دو بڑے نظریوں کی کشمکش تھی اور یہ آویزش صرف دو بھائیوں کی آویزش نہ تھی، صرف ملک گیری کی لڑائی نہ تھی، یہ دو مختلف اصولوں کی جنگ تھی۔ دو فکر (Ideology) کی کشمکش تھی، ایک اپنے پردادا کے طور طریقہ زندہ کرنا چاہتا تھا

دوسرا اپنے پردادا اور دادا کی سنت پر زندہ تھا کہتے ہیں کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ ہوتا تو آج مغلیہ سلطنت زندہ ہوتی ہو سکتا ہے کہ زندہ رہتی، مگر سرِدست ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے، یہ اسلام کا اس دیش سے جنازہ نکل چکا ہوتا۔ (۱۱) اورنگ زیب جیسا شخص اس شخص کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ آخر دارا شکوہ کے وہ کیا خیالات تھے جس کے خلاف اورنگ زیب نبرد آزما تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کے قول کے مطابق اگر دارا شکوہ بادشاہ ہوتا تو ملک سے اسلام کا جنازہ نکل جاتا اس کی وجہ کیا تھی مولوی محمد ذکا اللہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔ "اورنگ زیب کو دارا شکوہ سے نفرت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"اورنگ زیب کو دارا شکوہ سے بڑی نفرت اس سبب سے تھی کہ جس کو دارا شکوہ تصوف جانتا تھا اس کو اورنگ زیب الحاد سمجھتا تھا۔ دارا شکوہ ہندوؤں کے دین اور آئین کی طرف مائل تھا، برہمنوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ صحبت رکھتا تھا اور ان کو مرشد کامل اور عارف حق رسیدہ سمجھتا تھا اور ان کی وید کتاب کو آسمانی اور خطاب ربانی جانتا تھا اور اس کو صحف قدیم اور کتاب کریم خیال کر کے پڑھتا تھا، اور کمال اعتقاد کے سبب سے اس نے اطراف سے سنیاسی اور برہمن بڑی سعی سے جمع کیا تھا اور وید کا ترجمہ کرتا تھا اور ہمیشہ اس کام میں اپنے اوقات صرف کرتا تھا اور بجائے اسمائے حسنیٰ الٰہی کے پربھو جس کو ہندو اسم اعظم جانتے ہیں ہندی خط میں الماس و یاقوت و زمرد وغیرہ کے نگینوں پر نقش کرا کے پہنتا اور تبرک جانتا۔ وہ اس کا معتقد تھا کہ ناقصوں کے واسطے تکلیف عبادت ہے اور عارف کامل کو عبادت درکار نہیں، اور اس کی دلیل آیت کریمہ "واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین" بتاتا تھا اس لئے اس نے نماز، روزہ اور کل تکالیف شرعیہ کو خیرباد کہا۔ اس کے برعکس اورنگ زیب پاک اعتقاد تھا اور ہمیشہ دین مبین کی حمایت اور شرع حضرت سید المرسلین کی رعایت کو پیش نظر رکھتا، سلطنت و دولت کا مقصود ترویج شرع اور شاہی و سرداری کی غرض دین پروری سمجھتا تھا اور ہمیشہ وہ لڑکپن اور جوانی میں اپنے اوقات کو فرائض اور سنت و نوافل کی ادا میں صرف کرتا تھا اور حتی المقدور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں کوشش کرتا تھا وہ دارا شکوہ کے عقائد کو زندقہ اور الحاد کو باطل جانتا تھا اس سبب سے اس کی حمیت دین و مسلمانی کی رگ حرکت میں آئی تھی اور یہ بات سب پر روشن تھی کہ اگر دارا شکوہ فرمانروائی اور حکم رانی میں مطلق العنان

ہو گیا تو اس سے ارکان شریعت میں خلل پڑے گا اور حقیقت اسلام و ایمان کفر کے طنطنہ سے مبدل ہو جائے گا۔" (۱۲)

یہ طویل اقتباس ہونے والے اس لئے پیش کیا ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اورنگ زیب اپنے معاصر حکمرانوں میں اکیلا بادشاہ تھا جس کے نزدیک دنیاداری کے ساتھ دینداری بھی ایک اہم شی تھی، اورنگ زیب نے نہ صرف ملک کو وسیع کیا بلکہ اسلام کی بنیادوں کی حفاظت کی اور ان میں کسی قسم کا خلل واقع ہونے نہیں دیا۔ مجموعی لحاظ سے مغل حکمرانوں میں اورنگ زیب اپنی دینداری اور خدا ترسی، اور مذہب کے پاس و لحاظ میں مشہور ہے مگر اورنگ زیب ایک وسیع سلطنت پر متمکن ہوئے اور کئی برس تک مسلسل حکمرانی کرنے کے باوجود اپنا ایک جانشین نہیں چھوڑ سکا اور اس کے علاوہ ایک بادشاہ جو تعمیری کام کر سکتا ہے، اس نے انجام نہیں دیا، اور اپنے مخالفین و دین دشمن عناصر پر پوری طرح قابو نہ پا سکا اور خود اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم نہ کر سکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "اورنگ زیب عالمگیر جیسا بہ صفت موصوف بادشاہ تقریباً اکیاون سال بکمال دبدبہ و حشمت ہندوستان کے تخت پر متمکن رہ کر حکومت کرتا ہے لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کی عمارت کو گھن لگ چکا ہے اور اب وہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ عالمگیر کی وفات کے وقت ہندوستان کا حال یہ تھا کہ ملک میں انارکی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی مرہٹوں کی مرکزی طاقت کو اگرچہ توڑ دیا گیا تھا لیکن بقول محمد اکرام احمد صاحب "اب مرہٹہ کاشتکار سپاہی تھا جو کسی شیوا جی کے جانشین کے زیر قیادت اور کبھی کسی من چلے راجہ کی تابعیت میں ملکوں کے لئے عذاب جان بنا ہوا تھا، ہندو مذہب کے احیاء کا ایک عام چرچا تھا اور اس تحریک نے پنجاب میں، راجپوتانہ میں اور جنوبی ہندوستان میں خاص طور پر بہت زور پکڑا لیا تھا ان سب شورشوں کے علاوہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ڈچ اور طاقتیں تھیں جو ہندوستان کے مستقبل کا ایک دیرپا فاکہ تیار کر رہی تھیں (۱۳) اور جوں جوں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا ویسے ہی ان کے اندرونی اور آپس میں خلفشار پھیلتا جا رہا تھا اور مسلمانوں کی رہی سہی قوت ٹوٹ رہی تھی، ہندوستان کے اندر اور دوسری قومیں آباد ہو رہی تھیں اور مسلمان طوائف الملوکی کے جال میں پھنس کر زوال کے شکار ہو گئے تھے۔

"غرض کہ اس وقت ہندوستان کی حالت یہ تھی، سات سمندر پار کی رہنے والی قومیں اس ملک پر آہستہ آہستہ اپنے قدم جما رہی تھیں اور دوسری جانب مسلمان امراء اپنی بدنظمیوں اور شیعہ اختلال و انتشار کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں وہ سب اقتدار کے جھگڑوں اور اغراض کے بندے تھے۔" (۱۴)

ہم نے اس دور کی حکمرانی کا سرسری جائزہ لیا ہے، کیونکہ مثل مشہور ہے الناس علیٰ دین ملوکہم حقیقت ہے کہ جیسے حکمران ہوتے ہیں رعایا بھی ویسی ہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اس سرسری جائزہ سے عوام الناس کی مذہبی حالت اور ملکی حالت کا ایک حد تک اندازہ ہو گیا ہوگا۔

"یہ حالت تھی جب اسلام کا وہ آفتاب طلوع ہوا جس کو دنیا شاہ ولی اللہ کے نام سے جانتی ہے، مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا دور تھا جھوٹے فقراء و مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات کے اسرار و مطالب سے بے خبر تھے۔" (۱۵)

اور اسلام کا کوئی تصور ان کے پاس نہیں تھا۔ اسلام کا عالمگیر مفہوم گویا ناپید تھا۔ انھوں نے اسلام کو توہمات کے معنی میں ایک مذہب سمجھ رکھا تھا اور چند فقہی مسائل کو کل دین بنا کر فقہ و فتاویٰ کی پرستش میں مشغول تھے تقلید جامد کی گہری چھاپ کی وجہ سے ان کے ذہن و دماغ کی صلاحیتوں کو گھن لگ چکا تھا اور فکر و تدبر کے اعضاء معطل ہو چکے تھے، مذہب چند رسومات خانقاہوں تک محدود تھیں۔ علماء و مشائخ خانقاہوں میں سجادہ و منبر پر بیٹھ گئے تھے علماء باطن تصوف کے نام پر لوگوں کو اصلاح باطن کیلئے دنیا کے شور و عمل سے بچا کر کونوں اور گوشوں میں لا بٹھا دیا اور ان کے اندر ایسا تقویٰ پیدا کر دیا کہ اصلاح دنیا کیلئے میدان میں قدم رکھنا تقویٰ کے منافی سمجھا جانے لگا۔ یہ بیماری وہ ہے جو ہر زمانے میں موجود رہا ہے کبھی زور اور کبھی کم۔ لیکن قدرت کو چونکہ سرزمین ہند میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا منظور تھی۔ جیسے جس طرح دور اکبری میں حضرت مجدد الف ثانی پیدا ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا اسی طرح اورنگزیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل یعنی ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رونق افزائے عالم ہوئے اور آپ نے بھی وہی کام کیا جو حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے عہد میں کیا تھا۔ (۱۶) (جاری)

غزلیں

شرقی سبحانی

ایم اے پی ایچ ڈی

بہت مسرور تھے اہل غم کو ملتفت پا کر
پشیماں ہیں بہت ہم لوگ اس خلوت میں آکر
مری تخلیق میں مضمر ہے ایسی خانہ ویرانی
کہ صحرا ہی مجھے یاد آ رہا ہے اپنے گھر آکر
تعاقب کر رہا ہے اس کا ہر غم مگر ان بھی
کہاں آرام پائے تیرا دل اے نگار اب جا کر
تعلی قاتلوں نے کی تسلی چارہ گر نے دی
پلٹ آیا ہے تیرا نیم جاں مقتل سے گھبرا کر
گزرنے والے ہر جیحون خوں سے یوں گزرتے ہیں
یہ سرگوشی کی دامن لے تبانے سرخ دکھلا کر
محبت ایسا دریا ہے جسے تنہا بہتے ہیں
تنہا ایسا ساغر ہے پگھل جائے جو ہاتھ آکر
خدا آسان کر دے منزل دار و رسن اس پر
جناب شیخ کو مشکل سے ہم لائے ہیں سمجھا کر
کہاں تک اے زمانے برہمی سے تیری گھبرائیں
بہت سلجھا چکے دیکھیں گے تیری زلف الجھا کر
خود اپنی آگ میں شرقی کو جلنے دو پگھلنے دو
کہاں تک خوش رکھو گے اس کو یاد خواب دکھلا کر

محمد عزیز صائب المظاہری

مری اصل غایت خدا کی عبادت
اسی رب اعلیٰ کے دیں کی اقامت
جو بڑھ کر اٹھایا تھا بار امانت
وہی اپنا ٹھہرا حیا و شرافت
وہ کس کی اذاں نے کہا اس کو رسوا
خوشا میری توبہ، نہ ہے وہ انابت
خطا اور نسیاں ہے طینت میں اپنی
وہ رہ رہ کے لغزش پہ اشک ندامت
ہے اپنے ہی فکر و عمل سے زمانہ
زمانے کی کرتی ہے دنیا شکایت
زمیں اور زماں کا وہی ایک مالک
خدا کی زمیں پر خدا سے بغاوت
اٹھو اور بڑھ کر ان ہاتھوں سے چھینو
کہ انساں پہ ٹوٹی ہے جنس قیامت
ملا امتحان و بلا سے گزر کر
خلیل اللہ کو مقام امامت
زباں سے تو کلمہ پڑھا تو نے صائب
کوئی اس کی آخر عمل سے شہادت

حسن البناؒ شہیدؒ سے میری پہلی ملاقات

شیخ عمر تلمسانی مرحوم کی خود نوشت "یادوں کی امانت" سے ایک اقتباس

اخوان سے میرا ربط اور امام حسن البناؒ شہید سے میری ملاقات بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ اس ملاقات کی ابتدا کو سن کر ہی آپ انتہا تک کی تفصیل سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے جب وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو شبین القناطر میں اپنا دفتر کھول لیا۔ میری رہائش گیارہ کلومیٹر دور تلمسانی فارم پر تھی۔ میں گھر سے دفتر آنے اور واپس جانے کے لئے بس اور ریل گاڑی میں سفر کیا کرتا تھا۔ گھر پر میرا مشغلہ مرغی بانی تھا۔ اس فارم کے اندر میں نے اپنے دل کی تسکین کے لئے چھوٹا سا فارم کھول رکھا تھا اس میں مرغیوں کے علاوہ انواع و اقسام کے کبوتر اور خرگوش بھی پالتا تھا۔ اس فارم پر میرا مکان بھی تھا اور اس میں ایک پھلواری بھی تھی۔

۱۹۳۳ء کے اوائل کی بات ہے۔ یہ جمعہ کا روز تھا اور میں اس وقت پھولوں کے باغیچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ فارم کے چوکیدار نے آکر مجھے بتایا کہ دو اپ ٹو ڈیٹ قسم کے افراد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو زنان خانے میں جانے کا اشارہ کیا اور چوکیدار کو حکم دیا کہ مہمانوں کو اندر لے آئے۔ دونوں جوان اندر آئے اور تعارف کرایا۔ ایک تو عزت محمد حسن تھے اور دوسرے محمد عبدالعال۔ اول الذکر شبین القناطر کے مذبح خانے میں ملازم تھے اور آخر الذکر ڈیفار ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر۔ مہمانوں کے استقبال اور مدارات میں کچھ وقت گزرا۔ چائے پی چکے تو عزت محمد حسن نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا: "آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟" یہ سوال مجھے عجیب سا لگا اور میں نے اسے دخل در معقولات سمجھا اور مزاح کے انداز میں جواب دیا: "میں یہاں چوزے پالتا ہوں۔"

میرے مزاحیہ جواب سے مہمانوں کے اعصاب پر کوئی غیر معمولی اثر نہ ہوا بلکہ اس جواب کو سن کر عزت محمد حسن نے کہا: "آپ جیسے نوجوانوں کے لئے چوزے پالنا سے زیادہ اہم کام منتظر ہیں۔ میں لگتا

گفتگو کو سنجیدگی کے بجائے مزاح ہی کے موڈ میں سن رہا تھا سو میں نے اسی انداز میں سوال جڑ دیا۔

"وہ کیا چیز ہے جو چوزوں سے زیادہ میری توجہ اور محبت کی مستحق ہے؟" مہمان کا سنجیدگی بھرا جواب تھا "مسلمان آپ کی توجہ کے مستحق ہیں جو اپنے دین سے دور چلے گئے ہیں اور اس غفلت نے انہیں اتنا بے وقعت کر دیا ہے کہ ان کے اپنے وطن میں بھی ان کا کوئی وزن اور ذرہ بھر عزت نہیں رہی۔ اور اقوام عالم کے درمیان تو ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"میں اس پیچیدہ معاملے میں آخر کیا کر سکتا ہوں۔ میری بساط ہی کیا ہے؟"

مہمانوں نے بتایا کہ آپ اس میدان میں تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ جیسے نوجوانوں کی ایک تنظیم بن چکی ہے اور ایک عظیم شخصیت سید حسن البنا تنظیم کے رہنما اور مرشد عام ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ نوجوان میرے دفتر میں تشریف لائے اور بتایا کہ حسن البنا سے میری ملاقات کا پروگرام بن چکا ہے۔ مرشد عام قاہرہ میں شارع ناشا انجینئر یوسف خیابات کے علاقے میں عبد اللہ بک محلے میں رہتے تھے۔ ٹھیک وقت مقررہ پر میں مرشد عام کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور بڑا دروازہ کھل گیا۔ میں نے دستک دی اور جواب میں ایک آواز آئی "کون؟" میں نے جواب دیا "عمر تلمسانی، ایڈووکیٹ از شبین القناطر"۔ جس وہ شخص اوپر کے کمرے سے نیچے آیا اور میرا استقبال کیا پھر بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہوئے جو دائیں جانب کا کمرہ تھا اس کا دروازہ کھولا۔ میں میزبان کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے بالکل پتہ نہ چلا کہ کمرے کے اندر کیا ہے۔ میزبان نے کمرے کے اندر کی اکلوتی کھڑکی کھولی تو اندر روشنی آئی اور میں نے دیکھا کہ وہ کمرہ نہایت سادہ اور متواضع قسم کا چھوٹا سا دفتر تھا۔ دفتر میں چند کرسیاں پڑی تھیں جو روایتی انداز میں سرکنڈوں سے بنائی گئی تھیں۔ ان کرسیوں پر کچھ گرد و غبار تھا۔ میزبان ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے دوسری کرسی بیٹھنے کے لئے پیش کی۔ قیمتی سوٹ کے ساتھ اس کرسی پر بیٹھنا مجھے کچھ ناگوار لگا مگر میں نے جیب سے رومال نکالا اور کرسی پر ڈال کر بیٹھ گیا۔ میزبان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر پیارا سا تبسم رقصاں تھا۔

میں نے خیال کیا کہ مرشد عام میری اس حرکت پر شاید متعجب تھے۔ یہاں وہ مختلف راستے تھے۔ بہرحال وہ شخص جو اپنی فیشن پرستی اور خوش لباسی کا اتنا اہتمام کرتا تھا دعوت حق کے کٹھن

راستوں پر چل سکتے گا وہ کہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ اور کہاں جہاد فی سبیل اللہ کے تقاضے! دعوت حق کا فریضہ تو زندگی میں مشاکل و ابتلاء کو آتا ہے۔ اس میں تو عیش و عشرت سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اور تنہائی کے دکھ سہنے پڑتے ہیں۔

میری ظاہری شکوہ حیثیت کے باوجود مرشد عام کے چہرے پر کوئی تبدیلی یا اضطراب نہ تھا عام لوگ تو مجھے دیکھ کر دعوت حق کے فریضے کے لئے فوراً غیر موزوں قرار دے بیٹھتے مگر مرشد عام نے بڑے انہماک سے میرے سامنے اپنا پیغام اور پروگرام پیش کرنا شروع کیا۔ ان کا پیغام تھا اول و آخر یہی کہ شریعت حقہ کا مکمل نفاذ ہو اور اس مقصد کے لئے عوام الناس کی شعوری تیاری لوگوں کے سامنے اس حقیقت کو واشگاف کر دینا کہ کوئی خیر و بھلائی سوائے اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ شریعت ربانی کو مکمل طور پر اپنے انفرادی اور اجتماعی امور پر لاگو کیا جائے۔

"حسن البنا شہیدؒ نے بڑے مؤثر انداز میں دینی دعوت پیش کی اور اس سارے کلام کو میں پورے غور سے سنا۔ ان کی گفتگو کے دوران ایک بار بھی میں نے قطع کلامی نہ کی۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو مجھ سے پوچھا "کیا آپ کا اطمینان ہو گیا؟" قبل اس کے کہ میں زبان کھولتا فرمانے لگے "دیکھو ابھی جواب مت دینا۔ آپ کے پاس پورے ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ غور و فکر کرو۔ اپنے

دعوت حق کا راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو اسے قبول کرے اُسے صبر کا دامن تھام کر ڈٹ جانا چاہئے۔

دل کو ٹٹولو۔ دس کی رائے لو۔ میں آپ کو پکنک کی اور سیر سپاٹے کی دعوت نہیں دے رہا۔ میں جس بات کی طرف بلا رہا ہوں وہ جان جوکھوں کا کام ہے اگر آپ کا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ آپ کو شرح صدر عطا فرما دے، تو بسم اللہ! اگلے ہفتے بیعت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اور اگر آپ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار نہ پائیں تو بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ میرے لئے یہی کافی اور اطمینان بخش ہے کہ آپ اخوان المسلمون کے خیر خواہ اور دوست بن جائیں۔

جس ایمان افروز مجلس میں بیٹھنے اور جس بے نظیر گفتگو سے مستفید ہونے کی سعادت مجھے ملی تھی اس کے بعد بھلا کون بیعت کرنے میں لمحہ بھر کے لئے بھی تاخیر کرتا۔ مگر چونکہ مرشد کا حکم تھا اس لئے میں چلا گیا اور حسب الحکم ایک ہفتے بعد وقت مقررہ پر حاضر ہو گیا۔ اللہ پر توکل کیا اور

حسن البنا کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ بیعت میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے اخوان المسلمون کے ساتھ نصف صدی سے زیادہ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس بیعت کے بعد جب میں نے راہ حق میں قدم اٹھائے امتحان و آزمائش کی چکیوں سے مجھے گزرنا پڑا۔ یہ سارا کچھ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اس امتحان و آزمائش سے مجھے اور کچھ مقصود نہیں سوائے اپنے رب کے ہاں اسکا اجر پانے کی امید کے، میری دعا ہے کہ یہ سب کچھ خالصتاً لوجہ اللہ شمار ہو اور اس کا انعام اللہ ہی کے ہاں محفوظ رہے۔

یہ میری دلی تمنا ہے کہ آج کا نوجوان مسلم اس بوڑھے رفیق سانی سے جو اپنی زندگی کی بہاریں وقف کر چکا ہے یہ سبق سیکھے کہ اللہ نے امتحان و ابتلاء میں سے، جو مقدر کیا ہے اسے صبر جمیل اور بردباری سے برداشت کیا جائے اور خالق کی رضا پر ہر حال میں راضی رہا جائے۔

اللہ کے کسی فیصلے اور قضا و قدر پر ذرہ برابر بھی شکوہ اور ناراضی ظاہر نہ ہو۔ میری یہی آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ میرے شامل حال رہے اور جب میں دنیا سے رخت سفر باندھوں تو اللہ کے سپاہی کی حیثیت سے جاؤں۔ میری یہ آرزو ہے کہ میری امید صرف اللہ سے وابستہ رہے اور اسکے سچے وعدوں کا مجھے ایسا یقین کامل حاصل ہو جو میرے رگ و پے میں موجزن ہو جائے یہاں تک کہ مجھے یہ مقام نصیب ہو جائے کہ میں اپنے مولا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں یا اپنے ہاتھوں سے چھو سکوں بیشک کامیابی و رعایت کا مستحق اللہ نے اہل تقویٰ کو ہی بنایا ہے۔ میں اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے اور اخوان المسلمین کو تقویٰ کی زینت بخشے اور ہمیں اپنی نصرت اور مدد کا مستحق بنائے۔

"امام حسن البنا کے ساتھ میں نے اپنی پہلی ملاقات کا قصہ بیان کیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک جو امام سے ملا اس بات سے واقف ہے کہ شہید نے ہم سے پہلی ملاقات میں سارے حقائق کھول کر بیان کر دیئے۔ انھوں نے ہمیں سبز باغ نہیں دکھائے تھے۔ انھوں نے کبھی ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس راستے پر قدم رکھتے ہی دنیا ہمارے استقبال کو دوڑے گی یا ہمیں لوگ پھولوں کے ہار پہنائیں گے یا زندگی کی نعمتیں اور آسائشیں ہماری منتظر ہوں گی۔ نہیں بلکہ انھوں نے متنبہ کر دیا تھا کہ دعوت حق کا راستہ کانٹوں بھرا راستہ ہے، یہ کٹھن وادیوں کا سفر ہے، یہ دار و رسن کی راہ ہے جو اس دعوت کو قبول کرے اسے خوب سمجھ لینا چاہئے اور علی وجہ البصیرت قدم اٹھانا چاہئے پھر جب آزمائش کی گھڑی

حضرت ربیع بن زیاد حارثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تحریر۔ ڈاکٹر عبدالرحمان رافت پاشا ——— ترجمانی۔ ابو جاوید

ایک طرف تو شہر رسول مدینہ منورہ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتقال پر ملال پر اپنے مسلسل بہتے ہوئے اشکہائے غم کو پونچھنے میں مصروف تھا، دوسری طرف مختلف علاقوں کے وفود ان کے جانشین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سمع و رضا ہر حال میں بیعتِ خلافت کرنے کے لئے پے در پے مدینہ پہنچ رہے تھے۔

ایک صبح کو اہل بحرین کا وفد بعض دوسرے قبائل کے وفود کے ساتھ بارگاہ خلافت میں بیعت کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اراکان وفد کے ساتھ گفتگو کے بحد مشتاق رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی گفتگو میں انھیں کوئی عمدہ نصیحت کوئی مفید مشورہ، کوئی فکر انگیز گوشہ یا اللہ تعالیٰ، اسکی کتاب اور عام مسلمانوں کے خیر و فلاح اور ہمدردی کی کوئی بات مل جائے۔ چنانچہ انھوں نے حاضرین میں سے متعدد لوگوں کو گفتگو کے لئے اپنے پاس بلایا لیکن ان میں سے کسی نے بھی کوئی خاص اور اہم بات نہیں کہی۔ تب وہ ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوئے جسکے چہرے بشرے سے وہ پہلے ہی اندازہ کر چکے تھے کہ اس سے ضرور کوئی مفید اور قیمتی بات مل سکے گی۔ اُسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے گفتگو کا آغاز کرنے کی فرمائش کی۔ خلیفہ کی اجازت پاکر اُس شخص نے پہلے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر اپنی گفتگو ان الفاظ سے شروع کی۔

"امیر المومنین! امت کے معاملات کی ذمہ داری سپرد کر کے خدائے عز و جل نے آپ کو ایک زبردست آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ تو آپ خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی

میں ہمیشہ اس سے ڈرتے رہیئے۔ اور یہ جان لیجئے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے بھی کوئی ایک بکری ضائع ہوگئی تو قیامت کے دن اس کے متعلق آپ سے باز پرس کی جائے گی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کی یہ بات سن کر رو پڑے۔ ان کی آواز بلند ہوگئی اور پھر اسکو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے ابتک کسی نے مجھ سے ایسی سچی بات نہیں کہی جیسی کہ تم نے کہی ہے۔

تم کون ہو؟"

"میں ربیع بن زیاد حارثی ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"مہاجر بن زیاد کے بھائی؟" خلیفہؓ نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" حضرت ربیعؓ نے کہا۔

اس کے بعد جب مجلس برخاست ہوئی تو خلیفہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ اور ان سے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ربیع بن زیاد کے حالات کی پوری تفتیش کرو۔ اگر یہ اپنی اس بات میں مخلص اور بے لوث ہیں جو انھوں نے مجھ سے کہی ہے تو یہ بڑی خوبیوں کے مالک اور بڑے کام کے آدمی ہیں اور امور خلافت کی ادائیگی کے سلسلے میں ہمیں ان سے بہت زیادہ تعاون و امداد کی توقع ہے تم کوئی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے ان کے حالات سے مجھے برابر آگاہ کرتے رہنا۔"

اس کے چند ہی دنوں کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی ایما پر صوبۂ اہواز میں واقع شہر "مناذر" کی فتح کے لئے ایک فوج ترتیب دی اور اس میں حضرت ربیعؓ اور ان کے بھائی مہاجر کو بھی شامل کر لیا۔ حضرت ابو موسیٰؓ فوج لے کر روانہ ہوئے اور آگے بڑھ کر انھوں نے مناذر کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کے دوران اُس کے باشندوں کے ساتھ متعدد ایسی زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں جن کی نظیر

جنگوں کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی پیش آئی ہوگی۔ ان لڑائیوں میں ایک طرف تو مشرکین نے بے مثال اور غیر معمولی جرأت و مردانگی اور ناقابلِ تصور استقلال و ثباتِ قدمی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دوسری طرف بے اندازہ اور کثیر تعداد میں مسلمان سپاہی شہید ہوئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور مسلمان روزہ رکھ کر جنگ میں شریک تھے۔ حضرت ربیعؓ کے بھائی حضرت مہاجر بن زیاد نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی طرف سے کثیر تعداد میں سپاہی قتل ہو چکے ہیں تو انھوں نے خدا کی رضا کی طلب میں اپنی جان نثار کر دینے کی قسم کھائی۔ پھر انھوں نے اپنے جسم پر حنوط ملا، کفن پہنا اور اپنے بھائی کو وصیت کی ...... یہ دیکھ کر حضرت ربیع بن زیادؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا۔

"مہاجرؓ حالتِ صوم ہی میں اپنی جان راہِ خدا میں نثار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور مسلمانوں کے اوپر جنگ اور روزے کی دوہری سختیاں جمع ہو گئی ہیں، جن کی وجہ سے انکے عزائم کمزور پڑ گئے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ روزہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو آپ اس سلسلے میں سوچ سمجھ کر کوئی مناسب قدم اٹھانے کا فیصلہ کیجیے۔"

یہ سن کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے فوج سے پکار کر کہا۔ "مسلمانو! میں ہر روزہ دار کو قسم دلاتا ہوں کہ یا تو وہ روزہ چھوڑ دے یا جنگ سے الگ ہو جائے۔"

پھر انھوں نے خود لوٹے سے (جو ان کے پاس تھا) پانی پی کر اپنا روزہ افطار کر دیا تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کو پانی پیتے دیکھ کر اپنے روزے چھوڑ دیں۔ جب حضرت مہاجرؓ نے ان کا یہ اعلان سنا تو انھوں نے ایک گھونٹ پانی پی کر کہا۔

"خدا کی قسم میں نے پیاس کے مارے پانی نہیں پیا ہے بلکہ اپنے امیر کی قسم پوری کی ہے۔"

پھر انھوں نے اپنی تلوار بے نیام کی اور بے خوف و خطر دشمن پر پل پڑے۔ اور اسکی

صفوں کو چیرتے اور آدمیوں کو پچھاڑتے چلے گئے۔ جب وہ دشمن کی فوج میں کافی اندر تک گھس گئے تو انھوں نے ہر طرف سے ان کو گھیر لیا اور آگے پیچھے ہر طرف سے ان کے اوپر تلواروں کی بارش کر دی، جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ پھر دشمن نے ان کا سر تن سے جدا کیا اور اسے لے جا کر میدانِ جنگ میں ایک اونچے ٹیلے پر گاڑ دیا۔ حضرت ربیع بن زیادؓ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کتنے سعادت مند اور قابلِ فخر ہیں آپ اور کتنا عمدہ ٹھکانا ہے آپ کا۔ خدا کی قسم اگر اللہ نے چاہا تو میں آپ کا اور تمام مسلمان شہداء کا انتقام لے کے رہوں گا۔"

جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنے بھائی کے غم میں حضرت ربیع بن زیادؓ کی اس بے قراری اور ان کے اضطراب کی اس کیفیت کو دیکھا اور دشمن کے خلاف ان کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتشِ غیظ و غضب کا انھیں احساس ہوا تو وہ فوج کی قیادت سے دست بردار ہو گئے اور اسکی کمان حضرت ربیعؓ بن زیاد کو سونپ کر خود "سوس" فتح کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

حضرت ربیعؓ اپنی فوج کو لے کر مشرکین پر آندھی اور سیلاب بن کر ٹوٹ پڑے۔ دشمن ان کے حملے کی تاب نہ لاسکا، اسکی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور اسکی قوت مقاومت جواب دے گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو "مناذر" پر زبردست فتح عنایت فرمائی۔ انھوں نے لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور عورتوں، بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لیا۔ اس جنگ میں بے شمار مالِ غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔

معرکہ "مناذر" کے بعد حضرت ربیعؓ کا ستارۂ اقبال پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا اٹھا۔ اور ہر طرف ان کا شہرہ پھیل گیا۔ وہ ان نامور قائدین میں شمار ہونے لگے جن کے ناموں کے ساتھ عظیم الشان کارنامے وابستہ ہیں۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے سیستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس فوج کی قیادت انھیں کے سپرد کی گئی۔ سب کو اس بات کی توقع تھی کہ فتح و کامرانی ان کے ہم رکاب ہوگی۔

حضرت ربیع بن زیادؓ مجاہدینِ فی سبیل اللہ کا لشکر لئے ہوئے سیستان کی طرف

روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر انھیں دو سو پچیس میل لمبے اس دشوار گزار اور پُرخطر صحرا کو عبور کرنا پڑا جس کو پار کرنے سے صحرا کے باسی، وحشی درندے بھی عاجز تھے۔ اس خوفناک اور بھیانک صحرا کو عبور کرنے کے بعد حدودِ سجستان پر سب سے پہلا شہر جو اُن کے سامنے آیا وہ "رستاقِ زالق" تھا۔ اسکی آبادی عالی شان محلات و قصور پر مشتمل تھی۔ پورا شہر چاروں طرف سے بلند اور مضبوط و مستحکم فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں غلوں، پھلوں اور مال و دولت کی بے حد فراوانی تھی۔

ذہین اور دانا قائد حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رستاقِ زالق میں اپنے جاسوس پھیلا دئے تھے ان جاسوسوں کے ذریعے انکو معلوم ہو چکا تھا کہ لوگ اپنی عید "مہرجان" کے موقع پر عنقریب ایک محفل میں جمع ہونے والے ہیں۔ حضرت ربیعؓ اس مناسب موقع کے منتظر رہے اور آخر کار عید "مہرجان" کی رات میں اچانک بے خبری کی حالت میں حملہ کر کے انھیں تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور بزورِ شمشیر "رستاقِ زالق" پر قابض ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بیس ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے انھیں لونڈی، غلام بنا لیا۔ اور ان کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ قیدیوں میں کسی زمیندار کا ایک غلام بھی تھا مسلمانوں نے اسکو اس حال میں گرفتار کیا تھا کہ اس نے اپنے آقا کے پاس لے جانے کے لئے تین لاکھ کی خطیر رقم جمع کر رکھی تھی۔ حضرت ربیعؓ نے اس سے پوچھا کہ

"اتنا سارا مال تم نے کہاں سے جمع کیا؟"

"اپنے آقا کے صرف ایک گاؤں سے۔" غلام نے جواب دیا۔

"صرف ایک گاؤں سے اتنی ساری آمدنی ہوتی ہے؟" حضرت ربیعؓ نے دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں" غلام نے جواب میں کہا۔

"وہ کس طرح؟" حضرت ربیعؓ نے پھر دریافت کیا۔

"ہماری کلہاڑیوں، ہماری درانتیوں اور ہماری محنتوں کی بدولت۔" غلام نے جوابا

عرض کیا۔ جب جنگ ختم ہو گئی اور زمیندار اپنا اور اپنے اہل و عیال کا فدیہ ادا کرنے کے لئے حضرت ربیعؓ کی خدمت میں باریاب ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "اگر تم مسلمانوں کے لئے کسی بڑی رقم کی پیش کش کرو تو میں تمہارا فدیہ قبول کر سکتا ہوں۔"

اس نے پوچھا "آپ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

"میں یہ نیزہ زمین میں گاڑ دیتا ہوں۔ تم اسکو سونے چاندی سے ڈھک دو۔" حضرت ربیعؓ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"آپ کی یہ شرط مجھے منظور ہے۔" زمیندار نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے خزانے سے سونے، چاندی کے ڈھیر نکالے اور اس نیزے پر ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ چھپ گیا۔

حضرت ربیعؓ بن زیاد اپنی فوج کے ساتھ سرزمینِ سجستان میں کافی دور تک اندر گھستے چلے گئے اور ہر جگہ فتح و کامرانی نے ان کا استقبال کیا۔ دشمن کے قلعے ان کے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے اس طرح گرتے چلے گئے جیسے بادِ خزاں کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے گرتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ ان کے سامنے تلواریں بے نیام ہوں، شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ جلد از جلد اپنے لئے امان حاصل کر لیں۔ اس طرح حضرت ربیعؓ علاقوں پر علاقے فتح کرتے اور کامرانی و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے سجستان کے پایۂ تخت "زرنگ" تک جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ دشمن ان سے مقابلہ کرنے کے لئے پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار اور زبردست جمعیت فراہم کر کے پیش قدمی کرنے پر آمادہ ہے اور اس بات کا عزم بالجزم کر رکھا ہے کہ انھیں اس بڑے شہر سے مار بھگائے گا اور ان کی فوج کو سجستان سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا، خواہ اسکے لئے اسکو کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

پھر ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ایسی خونریز اور ہلاکت آفریں

معرکہ آرائی ہوئی جس نے فریقین کو بے بس کر رکھ دیا۔ اس جنگ میں جانبین میں سے کسی نے بھی اپنے آدمیوں کی قربانی دینے میں کسی قسم کی بخالت سے کام نہیں لیا۔ لیکن پھر جنگ کا پانسہ پلٹا اور جب مسلمانوں کی فتح کے ابتدائی آثار ظاہر ہوئے تو ایرانی سپہ سالار "پرویز" نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ جب تک اس کے پاس طاقت بچی ہوئی ہے، حضرت ربیعؓ کے ساتھ صلح کی کوشش شروع کر دے، ممکن ہے کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لیے بہتر شرائط پر صلح کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنا ایک قاصد حضرت ربیعؓ بن زیاد کے پاس بھیجا اور ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ اس سے ملاقات کے لیے کسی مناسب جگہ اور وقت کا تعین فرما دیں، تاکہ وہ اُن سے صلح کی بات چیت کر سکے۔ حضرت ربیعؓ نے اسکی یہ بات منظور فرمالی۔ قاصد کے واپس جانے کے بعد انھوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ "پرویز" کے استقبال کے لئے ایک موزوں جگہ کا انتخاب کریں۔ اور ان سے یہ بھی کہا کہ ان کی نشستگاہ کے چاروں طرف ایرانی مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیں اور اس کی گذرگاہ کے دونوں جانب اسکے فوجیوں کی لاشیں غیر مرتب طور پر بکھیر دیں۔

حضرت ربیعؓ نہایت بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قد لمبا، سر بڑا، رنگ گندمی اور ڈیل ڈول ایسا زبردست تھا کہ دیکھنے والا ان سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب "پرویز" صلح کی گفتگو کرنے کے لئے ان کے پاس پہونچا تو مرعوبیت کی وجہ سے تھر تھر کانپنے لگا اور لاشوں کے اس منظر کو دیکھ کر خوف و ہراس کے مارے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اوپر اس طرح خوف مسلط ہو گیا کہ وہ حضرت ربیعؓ کے قریب آنے اور آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ دور ہی کھڑے ہو کر ہکلاتے ہوئے اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے خوشامدانہ انداز میں ان سے بات کی اور اس شرط پر صلح کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن کو ایک ہزار غلام پیش کرے گا جنمیں سے ہر ایک کے سر پر ایک سنہرا جام ہوگا۔ حضرت ربیعؓ نے اس کی یہ پیشکش قبول فرما کر اسکے ساتھ صلح کر لی۔ اور دوسرے دن وہ اس شان سے شہر میں داخل ہوئے کہ غلاموں کی جماعت ان کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھی اور پوری فضا مسلمانوں کی تہلیل و تکبیر کے

فلک بوس نعروں سے گونج رہی تھی۔

حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک شمشیر برہنہ تھے جس سے وہ دشمنانِ خدا پر حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لئے بہت سے علاقے فتح کئے اور مختلف صوبوں کی گورنری کے فرائض انجام دیئے، یہاں تک کہ جب بنو امیہ کی حکومت کا دور آیا تو حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما نے انھیں خراسان کا گورنر بنا دیا۔ حالانکہ وہ دل سے اس ذمہ داری کو انجام دینے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی کراہت و ناپسندیدگی میں اس بات نے مزید اضافہ کر دیا کہ بنو امیہ کی حکومت کے ایک نہایت اہم اور ذمہ دار رکن "زیاد ابن ابیہ" نے جب ان کو لکھا کہ

"امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کا حکم ہے کہ جنگ میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں سے سونے اور چاندی کو مرکزی بیت المال کے لئے مخصوص کر دو۔ اور ان کے علاوہ باقی چیزیں مجاہدین میں تقسیم کر دو۔"

تو انھوں نے اس کے جواب میں تحریر کیا کہ

"تم نے امیر المومنین کی طرف سے جو بات لکھی ہے۔ کتاب اللہ کا حکم اس کے خلاف ہے۔" پھر انھوں نے فوج میں اعلان کروا دیا کہ سب لوگ آکر مال غنیمت میں سے اپنے اپنے حصے لے جائیں۔" اس کے بعد انھوں نے خمس دارالخلافہ "دمشق" بھجوا دیا۔

اس خط کے موصول ہونے کے اگلے دن جمعہ تھا۔ حضرت ربیعؓ نے سفید کپڑے پہنے، نمازِ جمعہ کے لئے مسجد تشریف لائے۔ جمعہ کا خطبہ دیا اور خطبہ کے بعد فرمایا کہ

"لوگو! اب میں زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ میں ایک دعا کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ میری اس دعا پر آمین کہیں۔" پھر انھوں نے دعا کی "خدایا! اگر تو میرے حق میں کسی خیر کا ارادہ رکھتا ہے تو مجھے جلد از جلد اپنے پاس بلا لے۔"

حاضرین مجلس نے آمین کہی، اور اسی روز کا سورج ابھی آسمان میں غروب نہیں ہوا تھا کہ جرأت و شجاعت اور عزم و حوصلہ کا یہ ستارہ تاباں سرزمین خراسان میں روپوش ہو چکا تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اسلامی تاریخ میں فنِ تعلیم کے ارتقائی مراحل

تحریر ———— عبداللطیف الطیباوی
ترجمہ و تلخیص ———— عارف اعظمی

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی حیثیت کے ساتھ درس و تدریس اور علم دوستی کی خدمت ہوتی رہی ہے۔ اسلامی ثقافت کے اس طویل تاریخی سلسلے میں حکومتیں بھی فنِ تعلیم و تربیت کی سرپرستی کرتی رہی ہیں لیکن اکثر و بیشتر صرف شیدایانِ علم نے محض اپنے دینی احساس و بیداری اور علمی ذوق و شوق کی بناء پر اس کی خدمت کی ہے جبکہ حکومتیں اس اہم اور بنیادی ضرورت سے بیزار اور لاتعلق رہی ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور میں عمومی طور پر مسلم بچوں کی تعلیم کے صرف دو ذریعے "مکتب" اور "مجلس" ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض خصوصی وسائل بھی تھے لیکن وہ فنِ تعلیم و تربیت کی تاریخ سے مستثنیٰ قرار پائے گئے۔ مثلاً خلفاء اور امراءِ سلطنت اپنے بچوں کی تعلیم اور ان کی تربیت کے لیے بطور خود یا مشاہرہ اساتذہ و معلمین کا نظم کیا کرتے تھے جو "مؤدب" کہلاتے تھے۔

مکتب میں معمولی نوشت و خواند، قرآن مجید اور حساب کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کی کوئی متعین جگہ نہیں ہوتی تھی بلکہ استاد اپنے گھر پر یا ایسی جگہ جہاں اس کی کوئی مشغولیت ہوتی تھی تعلیم دیا کرتا تھا۔

اس کے برعکس "مجلس" کسی مسجد یا مخصوص درسگاہ میں تعلیمی حلقوں کی شکل میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ جس میں اربابِ فضل و کمال اور علم و فن کے یکتائے روزگار اساتذہ اور مشہور علماء تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔

اگرچہ "مکتب" کی ابتدائی تعلیم کے بعد بچے اس سے کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ لیکن جو بچے مزید علم و فضل کے جویا اور علم و عرفان کے خواہاں ہوتے تھے وہ جس موضوع سے دلچسپی اور لگاؤ رکھتے تھے اس کی تکمیل کے لئے اسی فن کے کسی مشہور اور شہرت یافتہ استاد کی مجلس میں حاضر ہوتے اور اس کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کر لیا کرتے تھے۔

عام طور پر مکاتب و مجالس کے اساتذہ بچوں کے سرپرست یا والدین سے تعلیم کی اجرت لیا کرتے تھے

البتہ کلامِ پاک کی تعلیم پر اجرت لینی معیوب تصور کی جاتی تھی۔

یہ مکاتب و مجالس حکومتوں کی دلچسپی اور ان کے تعاون سے محروم تھے، حتیٰ کہ عصری علوم پر بھی اربابِ اقتدار کی توجہ نہیں تھی، حالانکہ اس دور میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے جبکہ خلفاء اور فرمانروایانِ حکومت کو شدت سے منظم تعلیم و تربیت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود مکاتب و مجالس کی اہمیت کو نظرانداز کیا گیا۔ مثلاً جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں دفتری نظام (دیوان) کی داغ بیل ڈالی تو حکومتِ اسلامیہ کو ایسے باصلاحیت اور ممتاز ماہرین حساب و ریاضیات کی ضرورت ہوئی جو اس کا نظم و نسق سنبھال سکیں۔ اسی طرح عبدالملک بن مروان کے عہد میں جب دفتری امور کے کاغذات حساب دیگر زبانوں سے عربی میں منتقل کئے گئے، اس وقت بھی ان کاغذات کی ترتیب و تنسیق اور اس کی نگرانی کے لئے ایسے کارندوں کی ضرورت تھی جو عقل و فہم کے ساتھ منظم تعلیم و تربیت کی دولت سے مالامال ہوں۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بعض خلفاء اور امراء نے تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کی اہمیت و ضرورت محسوس کی جس کی بناء پر ان کی توجہ و دلچسپی سے متعدد ادارے وجود پذیر ہوئے جن کا معیار مکتب کے معیار سے قدرے بلند اور مجلس کے تقریباً برابر ہوا کرتا تھا۔ یہ ادارے مختلف ناموں سے معروف تھے لیکن ان کا سب سے مشہور نام جو آج تک زبان زد ہے وہ "بیت الحکمت" تھا۔

ہارون رشید اور مامون کے عہدِ حکومت میں ان اداروں کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔ ان میں عظیم الشان لائبریریاں ہوا کرتی تھیں، مختلف زبانوں کے علوم و فنون عربی میں منتقل کئے جاتے تھے۔ (۱)

---

(۱) بیت الحکمت دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک کتب خانہ کے لئے خاص تھا، اور دوسرا غیر زبانوں کے ترجمہ کے لئے؛ اس عظیم کتب خانے میں عربی زبان کے علاوہ ہندی، فارسی، یونانی، قبطی، کلدانی زبانوں کی بے شمار کتابیں یکجا کی گئیں تھیں یحییٰ ابن خالد برمکی نے جو کہ ہارون رشید کا وزیر اعظم اور خلافت عباسیہ کا چشم و چراغ تھا ہندوستان میں قاصد بھیجے اور بڑے بڑے پنڈت اور حکیموں کو دربار میں بلوایا۔ یہی پنڈت تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کا بہت بڑا علمی سرمایہ بغداد پہنچا۔ .... مامون نے اس عظیم کتب خانے میں عرب جاہلیت کے زمانہ کا بہت کچھ سرمایہ جمع کیا تھا، جاہلیوں کے قصائد اور اشعار کے علاوہ اس زمانہ کے خطوط، دستاویزات، معاہدے جہاں کہیں مل سکے نہایت کوشش سے فراہم کئے تھے۔

(ماخوذ از رسائل شبلی) عارف

ابتدا میں ان اداروں کے آغاز و افتتاح کا عام دستور یہ تھا کہ کوئی خلیفہ یا کوئی رئیس اس کی بنیاد رکھتا اور اس کے لئے کافی اراضی و جائیداد وقف کر دیا کرتا تھا جس سے طلباء کی ضروریات اور ان کے تعلیمی اخراجات کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

آغاز اسلام سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک اسلامی مدارس اور فن تعلیم و تربیت کی یہ ابتدائی صورت رہی۔ چوتھی صدی ہجری سے عمومی طور پر حکومتوں نے تعلیم و تربیت سے دلچسپی لی اور اس کا تعاون کرنا شروع کیا۔ لیکن ان کی توجہات اور دلچسپیاں بیت الحکمت جیسے اعلیٰ تعلیمی اداروں تک محدود رہیں۔ ابتدائی تعلیم کے مراکز، مکاتب و مجالس ہنوز ان کی توجہ سے یکسر محروم رہے۔

اسی عہد میں فاطمیوں نے "دار العلم" اور "جامع ازہر" کا سنگ بنیاد رکھا جس کا بنیادی مقصد مذہب شیعہ کی تعلیم و تلقین اور اس کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت تھا۔ یہ "دار العلم" اسلامی تاریخ میں وہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو کلی حکومت کے تعاون و امداد سے وجود میں آیا تھا، اساتذہ کی تنخواہیں، طلباء کے وظائف اور کتابیں فاطمی حکومت فراہم کیا کرتی تھی۔

فاطمیوں اور بنو عباس کے مابین شدید سیاسی کشمکش اور مذہب و فکر کی رسہ کشی تھی اور اسی بنیاد پر دار العلم کا قیام عمل میں آیا تھا جس کے پیش نظر مذہب شیعہ کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ مسلک اہل سنت و جماعت کو زک پہنچانا تھا کیونکہ اس کے ماننے والے ان کے حریف اور مقابل بنو عباس تھے۔

دار العلم اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ گویا اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس کے ذریعہ فن تعلیم کو پہلی مرتبہ آلہ و وسیلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

دار العلم کے جواب میں عباسیوں نے پانچویں صدی ہجری میں "المدرسہ"(1) کی بنیاد رکھی جس کا مقصد دار العلم کے تعلیمی پیرائے میں فکری حملوں کا دفاع تھا۔ کیونکہ دار العلم کی جانب سے علمی اور ثقافتی محاذ پر اقدامات اور حملے ہو رہے تھے اور اس کا دفاع اسی میدان سے ممکن تھا۔

شام و مصر کے علاوہ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں "المدرسہ" کی شاخیں کھولی گئیں۔ رفتہ رفتہ ان کا ایک جال بچھ گیا۔

(1) "دار العلم" اور "المدرسہ" دو مخصوص ادارے ہی نہ تھے بلکہ دو مکتب فکر کے ترجمان ادارے تھے جن کی متعدد شاخیں بلاد اسلامیہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ — عارف

یہ تمام مدرسے "المدرسہ" کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک کی جانب منسوب ہو کر "مدرسہ نظامیہ" کہے جانے لگے۔

"المدرسہ" اور "دار العلم" کی نمایاں اور امتیازی خصوصیات تقریباً یکساں تھیں۔ مقدم الذکر میں صرف شافعی فقہ پڑھائی جاتی تھی، عربی زبان کے قواعد و گرامر سکھائے جاتے تھے۔ اساتذہ کی تنخواہیں اور طلباء کی تعلیمی ضروریات مدرسہ فراہم کیا کرتا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کی یہ منظم شکل جو ہمکو پانچویں صدی ہجری میں نظر آتی ہے اسلام کے ابتدائی عہد میں کیوں نہیں ظاہر ہوئی؟

ہم ذیل میں قدیم اہل قلم کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ جن کی روشنی میں قارئین کو اس کا جواب بھی مل جائیگا اور اس کا بھی اشارہ مل سکے گا کہ کیوں کر یہ تمام مدارس نظام الملک کی جانب منسوب ہو کر "مدارس نظامیہ" کہلائے۔

ایک مالکی فقیہ ابو الحسن القابسی القیروانی جو چوتھی صدی ہجری کے ممتاز علماء میں شمار کئے جاتے ہیں، لکھتے ہیں:

"اس امت کے ابتدائی عہد کے ائمہ و اکابر تمام خاص و عام مسلمانوں کے درپیش مسائل پر غور و خوض کیا کرتے تھے، لیکن ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ ان بزرگوں نے کبھی بچوں کے تعلیمی مدارس و مکاتب اور ان کے لئے اساتذہ کا انتظام اور مدرسین کے لئے مال فراہمی کی بابت بھی سوچ بچار کیا ہو۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات معاشرے کے سماجی اور مذہبی کاموں کی طرح (مثلاً مسجد میں اذان دینا وغیرہ) تعلیم دینے کو بھی اعزازی اور تطوع تصور کیا کرتے تھے۔

ان حضرات کی بابت یہ رائے قائم کرنا کہ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت سے لاپرواہی برتی اور اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کی نامناسب ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات بچوں کی تعلیم و تربیت کو تنہا والدین کی ذمہ داری اور فریضہ تصور کیا کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس سے صرف والدین کی ذاتی منفعت و مسرت وابستہ ہے۔"(1)

(1) ملاحظہ ہو الرسالۃ المفصلۃ لاحوال المتعلمین۔ احمد فؤاد الاہوانی

ایک شافعی مؤرخ تاج الدین سبکی جو کہ آٹھویں صدی ہجری میں گذرے ہیں بیان کرتے ہیں :۔

" ہمارے استاد ذہبی کا خیال ہے کہ نظام الملک نے سب سے پہلے اسلامی مدارس کا آغاز کیا۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ مدرسہ بیہقیہ جو کہ نیشاپور میں واقع ہے نظام الملک کی ولادت سے قبل وجود میں آچکا تھا۔ نیشاپور کا مدرسہ سعیدیہ جسکو سلطان محمود سبکتگین کے بھائی نصر بن سبکتگین نے تعمیر کروایا تھا اور استرابادی کا مدرسہ اور یہ تھا ایک مدرسہ جسکو ابو اسحاق اسفرائنی نے بنوایا تھا مدرسہ نظامیہ سے بہت پہلے وجود میں آچکے تھے۔

میرا خیال ہے کہ نظام الملک نے سب سے پہلے مدارس میں طلباء کے لئے وظائف کا نظم شروع کیا کیونکہ قطعی طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ نظام الملک سے پہلے اسلامی مدارس میں وظیفہ کا نظم تھا یا نہیں ؟ میرا زیادہ تر گمان یہ ہے کہ اس کا نظم نہیں تھا۔ (۱)

سبکی کا یہ خیال کہ نظام الملک نے سب سے پہلے وظیفہ کا نظم شروع کیا ان حقائق سے ٹکراتا ہے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ نظام الملک سے پہلے کافی ایسے بزرگ گذرے ہیں جنھوں نے مدارس کا آغاز بھی کیا اور طلباء کے لئے وظیفے بھی مقرر کئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ نظام الملک نے کافی تعداد میں عراق و خراسان کے علاقوں میں مدارس کھولے تھے لہٰذا اسی بنیاد پر تمام اسلامی مدارس انھیں کی طرف منسوب ہو کر "نظامیہ" کہے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ عرف میں یہ نام صفت کی شکل اختیار کر گیا اور ہر وہ مدرسہ جو حکومت کے تعاون سے قائم ہوتا مدرسہ نظامیہ کہا جاتا تھا۔

نظام الملک کے مدرسوں میں سب سے مشہور اور قابل ذکر مدرسہ نظامیہ بغداد ہے۔ جو ۴۵۹ھ میں شروع کیا گیا۔ اس کے مشہور استاد ابو حامد غزالی تھے

مدارس اسلامیہ کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ابتدائی تعلیم میں کوئی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ حکومت کی دلچسپیاں اعلیٰ تعلیم ہی سے وابستہ تھیں۔ ابتدائی تعلیم کو کتابی کے بقول والدین کی ذمہ داری و فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مکاتب و مجالس موقوفہ جا بجا دیر چلتے رہے بیت المال سے کوئی خاص تعاون حاصل نہ تھا۔

مدارس نظامیہ کا تعلیمی معیار استاد کی صلاحیت اور شہرت پر موقوف ہوا کرتا تھا۔ کوئی اشمیں۔

(۱) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۔ ج ۴ ص ۳۱۴ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۴ھ

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

"ادارہ"

تعارف و تبصرہ

نیا دور — فراق نمبر حصہ دوم ، آفسٹ کی خوبصورت کتابت و طباعت
بڑا سائز ، صفحات ۲۲۸ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ
پتہ :- ایڈیٹر نیا دور ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ لکھنؤ یوپی

"فراق صاحب مشہور شاعر ، پڑھے لکھے آدمی تھے اور بہت ذہین تھے ان باتوں سے کسی کو اختلاف شاید ہی ہو۔ ہاں اختلاف اس بارے میں ہو سکتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ کیا تھا۔ ایک مشکل یہ ہے کہ فراق کو ہم میں سے بیشتر نے ان مضامین کی روشنی میں سمجھنا چاہا ہے جو خود ان کے لکھوائے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ کبھی اپنے نام سے اور کبھی دوسروں کے نام سے اپنی شاعرانہ خصوصیات (اپنی آفاقیت) کی تفصیلات بیان کیا کرتے تھے اردو شاعری میں ایسا شاید ہی کوئی دوسرا شخص ہو جس نے زندگی بھر اپنا پروپیگنڈہ اس طرح کیا ہو" ——— "صورت حال یہ ہے کہ ان کی غزلوں کے کچھ اشعار واقعتاً اچھے ہیں اور بعض بہت اچھے ہیں مگر ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو فضولیات سے بھرا ہوا ہے انھوں نے غزل کو صنف کی حیثیت سے کسی نئی چیز سے روشناس نہیں کیا۔ ان کے جو اچھے شعر ہیں وہ سب وہی ہیں جن میں غزل کی پرانی روایت سلیقے سے معرض اظہار میں آئی ہے جس نئے پن کے وہ مدعی رہے ہیں وہ نیا پن غزل کی پرانی روایت کے مقابلے میں درجہ امتیاز حاصل نہیں کر سکا" (رشید حسن خاں ۔ چند تاثرات نیا دور ۲ ص ۹)

"فراق اپنی تمام ناہمواریوں اور تضادات کے باوجود ایک ایسے جوہر قابل ہیں جو بقول جوش ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکہ اور اردو زبان کی آبرو و اردو شاعری کی مانگ کا صندل کہے جا سکتے ہیں وہ ایک ایسی جاندار تخلیقی قوت کے مالک ہیں جو شخصیت کے تمام تضادات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے گوئٹے کے بارے میں کہا ہے کہ وہ تمام

گناہوں کا نچوڑ تھا جو ایک بالغ یا جوہر خلاق میں فطری اور لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔" یہ قول اگر ہندوستان میں کسی پر صادق آسکتا ہے تو بقول مجنوں گورکھپوری وہ صرف رگھوپتی سہائے فراق کی ذات ہے۔

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد "فراق کے ایزد و اہرمن" نیا دور ۲ ص ۱۰۸)

"فراق کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک اچھے فنکار ہیں اور ستارہ می شکند آفتاب می سازند کا آرٹ انھیں بخوبی آتا ہے لیکن وہ ضرب کاری اور نگاہ بیدار دونوں سے محروم ہیں۔" ص ۱۴۰

"جوش کے برعکس فراق جنسیت کا ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے لارنس کی طرح جسمانیات کو روحانیات میں مدغم کرنے کی کوشش کی ہے، جنس کے ڈانڈے تصوف و تلذذ دونوں سے ملائے ہیں، وہ نہ وصال کے شاعر ہیں نہ فراق کے، لیکن حسن کی ہر ادا کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کے ضرور عادی ہیں اور اپنی نا آسودگی کا راز دوسروں پر افشاں کرتے رہتے ہیں۔"

(ڈاکٹر سید عبدالباری۔ فراق مجموعہ اضداد نیا دور ۲ ص ۱۲۵)

"فراق صاحب غزل کے تو بادشاہ ہیں۔ ان کی غزلوں نے کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ لوگ اکثر ان کی نظموں کو نظر انداز کر جاتے ہیں، انھوں نے نظموں میں بھی تجربات اور ہیئت کے نئے تجربے کئے ہیں۔ ان میں حقیقت نگاری بھی ہے اور کیفیات بھی۔ موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے، غزلوں کی طرح رمزیت و معنویت، ایمائیت و اشاریت اور تشبیہات و استعارات سے کام لے کر انھوں نے نظموں کو بڑی دل آویزی عطا کی ہے۔

فراق نے صنف رباعی کو بھی ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ عام طور سے رباعی میں اصلاحی، حکیمانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین نظم کئے جاتے تھے۔ فراق نے سنگھار رس اور جمالیات کو موضوع سخن بنایا یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اردو ادب میں ان کا بیش بہا اضافہ ہے۔ رباعیوں میں سنسکرت اور ہندی کے نرم اور سبک الفاظ بڑی خوبصورتی اور روانی سے استعمال کئے گئے ہیں، اردو زبان کے لئے یہ ایک فال نیک ہے۔ ۔۔۔ فراق صاحب نے بڑی نازک، شگفتہ، نادر اور حسین تشبیہات

سے حسن کے مرئی پیکر کو سنوارا ہے۔

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی — کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
زلف شبگوں کی چمک، پیکر سیمیں کی دمک — دیپ مالا ہے سر گنگ جمن کیا کہنا
حسن کی صباحت کو کیا بتایئے جیسے — چاندنی مناظر پر پچھلی رات ڈھلتی ہے

(اقبال ساحر۔ فراق گورکھپوری۔ ایک ہمہ گیر شخصیت: نیا دور ۲ ص ۱۴۲)

یہ چند اقتباسات ہیں جو فراق نمبر سے میں نے نقل کر دیا ہے، اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس نمبر میں فراق گورکھپوری پر کیا کچھ نہیں ہے۔ پورے نمبر کا مطالعہ کرنے سے فراق کی زندگی کے اکثر پہلو سامنے آجاتے ہیں اور فراق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر نیا دور کے دونوں نمبروں کو ملا کر پڑھا جائے تو فراق کی زندگی اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ اس شمارہ کے خاص خاص لکھنے والے یہ ہیں: پروفیسر ممتاز حسین، ظ انصاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، احتشام حسین، سید سبط حسن، ڈاکٹر ملک زادہ منظور، سید عبدالباری، کبیر احمد جائسی، نذیر بنارسی، شمس تبریز خاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ شعرا کرام کی منظوم خراج عقیدت ہے۔ یہ فراق گورکھپوری کی شخصیت اور فن پر ایک کامیاب نمبر ہے جو ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے مزین ہے اور تزئین و ترتیب میں کافی محنت کی گئی ہے۔ اس کے لئے ایڈیٹر امیر احمد صدیقی، جوائنٹ ایڈیٹر شاہنواز قریشی اور پبلشر عبدالشکور مبارکباد کے مستحق ہیں، اور ان کی یہ کوششیں فراق کو بہترین خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔ آئندہ جب بھی کوئی فراق کی زندگی پر کچھ تحریر کرے گا، نیا دور کے یہ دونوں نمبر اس کی ضرور رہنمائی کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ فراق کی شخصیت ایک متنازع شخصیت رہی ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کی خوب خوب تعریف کی، ان کو اردو زبان کی آبرو، جدید لب و لہجہ کا شاعر اور تغزل کا بادشاہ کہا اور کچھ لوگوں نے ان پر تنقید کی اور ان کی زندگی کے مختلف کمزور پہلوؤں کو نیز ان کے فن کی خامیوں کو سامنے دکھایا لیکن فراق پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور معاصرین پر حاوی اور چھائے رہے تاہم فراق گورکھپوری کو اردو زبان و ادب غزل و نظم نیز رباعی میں جو مقام عطا کیا گیا اور جس انعام و اکرام سے نوازا گیا وہ ان کی اصل حیثیت اور مقام سے کئی گنا زیادہ ہے۔ فراق ایک ذہین اور چالاک انسان تھے

تعلیمی خطہ میں رہنے کی وجہ سے ان کا مطالعہ کافی وسیع اور گہرا تھا۔ انھوں نے انگریزی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا نیز ہندی اور سنسکرت زبانوں سے بھی خوشہ چینی کی اور ان کے ذریعہ دوسری قوموں کے ادبی سرمایہ سے بھی ایک حد تک استفادہ کیا اور جو بھی اسلوب، طرزِ ادا، فکر و خیال پسند آیا اردو کے قالب میں ڈھال دیا اور الفاظ کا جامہ پہنا کر اشعار کی لڑیاں بناتے چلے گئے۔ اگر فراق کی شاعری، نظم گوئی، تقریر و تحریر اور رباعیوں کا تجزیہ کیا جائے جیسا کہ ڈاکٹر نریش چندر اور کچھ دوسرے لوگوں نے کیا ہے اور ان کے تمام سرمایہ کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو حقیقت حال اور واضح ہو جائے گی۔

انانیت، غرور، تکبر، غصہ، ضد، شراب، کباب، حسن و عشق، حسن شاعر میں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں، وہ فراق تھے۔ فراق کو پبلسٹی کے گر، فوائد اور طریقے معلوم تھے۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ابھارا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ معاصرین کو کس طرح خاموش کیا جا سکتا ہے، چنانچہ کسی کو گالی دے کر، کسی کی توہین کر کے، کسی کو ڈانٹ کر، اور کسی کی تعریف کر کے خاموش کر دیتے۔ ان کے سامنے بڑے بڑے لوگوں کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی کہ رگھوپتی کیا کچھ کہہ جائے۔ رگھوپتی سہائے فراق چلے گئے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انکے پورے سرمایہ کا کھلے ذہن کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور انکے صحیح مقام و مرتبہ کا تعین کیا جائے۔ ختم کرنے سے پہلے فراق کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار آپ کو سنانا یقیناً زیادتی ہوگی جو اس غریب بچہ کر دلّت رکھے گا۔ یہ "دستاویز انسانی" کے عنوان سے دیے جاتے ہیں۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اس ادا کا تیری جواب نہیں
مہربانی بھی سرگرانی بھی

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

زمین کروٹ بدلنے زندگی کے دن لے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

موت کا بھی علاج ہو شاید
زندگی کا کوئی علاج نہیں

ہائے یہ بے کسی محبت کی
سوچتے ہیں کہیں چلے جائیں

فراق چلے گئے مگر اشعار کی شکل میں انکی یاد باقی ہے۔ ان اشعار کو جب بھی کسی کے ہونٹ گنگنانے لگیں گے [illegible]

حلقۂ یاراں

سید عبدالباری شرقی
رفیق احمد رئیس احمد

برادرم — سلام مسنون

آپ کا خط ملا، فرمائش بجا، ایک غزل تعمیل ارشاد میں حاضر ہے۔ حیات نو برابر مل رہا ہے۔ ماشاء اللہ آپ نے اسے صوری و معنوی دونوں پہلوؤں سے ایک دلکش اور وقیع ماہنامہ بنا دیا ہے۔ آپ کو یاد آتا ہے کہ میں نے گذشتہ سال دوام کے چند شمارے دیکھے تھے پہلے میرا رسالہ اسی قدر قامت کا حامل تھا، آپ نے ماشاء اللہ اس سے مکمل حد تک حیات نو کو مشابہ بنا دیا۔ موضوعات میں بھی خوب "تنوع" آیا ہے۔ انٹرویو خاصے کی چیز ہے اس کا سلسلہ جاری رکھئے۔ اشفاق صاحب کا انٹرویو کافی دلچسپ ہے اور حنفی صاحب کا اس بار اسلہ بھی فکر انگیز ہے میں حنفی صاحب کے خیالات سے متفق ہوں ہم لوگوں نے پارلیمانی سیاست اور مسلمانان ہند کے موضوع پر ایک نہایت معلومات افزا اور فکر انگیز مباحثہ دوام میں ۱۵ سال قبل شروع کیا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا اس ملک میں اسلامی انقلاب جمہوری اداروں کو نظر انداز کر کے کس طرح آ سکے گا۔ یہ فقہی و کلامی مسائل میں تفریق بھی گرہ کن ہے۔ میرے خیال میں ہمارے تحریک اسلامی کے افراد سہل پسند ہو گئے ہیں اور نظریاتی بحثوں میں الجھے رہنا چاہتے ہیں۔ ملک کے اجتماعی مسائل کے حل کی طرف اقدام سے گریز کر رہے ہیں۔ اجتماعی مسائل اور سیاسی مشاغل بہت سے لوگوں کو دنیاداری کے کام نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں میں زہد و تقویٰ اور تزکیہ و تربیت کا وہ تصور جاگزیں ہو رہا ہے جو خانقاہوں میں مروج تھا۔ عصری زندگی اور اس کے مسائل سے لوگ دور ہٹ رہے ہیں۔ اور ایک چھوٹے سے دائرہ میں خود کو محدود کرتے جا رہے ہیں۔ لکن و جمود کا احساس شدید ہوتا جا رہا ہے اور اس کو بعض معصوم لوگ دنیاداری و دینداری کی حد فاصل سمجھنے لگے ہیں۔ اچھا ہے کہ اس موضوع پر آپ کھلکر اظہار خیال کی دعوت دیں۔

والسلام۔ خیر طلب
عبدالباری شرقی

مکرمی و محترمی جناب ایڈیٹر صاحب "حیات نو" السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اپریل ۸۶ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور کتابت و طباعت کی دلکشی پتہ دے رہی ہے کہ مدیر محترم انتہائی توجہ کے ساتھ حیات نو کو نئی زندگی دے کر اسے تندرست و توانا بنانے میں مشغول ہیں۔ اپنی عادت کے مطابق اس بار بھی اداریہ پہلے اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ زبان شاندار ہے، اور بیان بے حد جاندار۔ اس کے چبھتے ہوئے تیکھے جملے براہ راست دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ (اللھم زد فزد) لیکن راجیو گاندھی کی "خاندانی شرافت" کے ذکر سے نہ صرف اداریہ کا مزہ پھیکا پڑ گیا ہے بلکہ حیات نو کی "دیرینہ شرافت" بھی مجروح ہو گئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، آنجہانی اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کی "شرافت" پاکستان، بنگلہ دیش، کشمیر اور ہندوستان کے ان مظلوموں سے پوچھئے جو ابھی تک اپنی بنیادی اور فطری "شرافت" بحال کرنے میں ناکام ہیں۔ گاندھی خاندان کا تذکرہ کرنے اور اس کے افراد کی مدح سرائی کرنے کے لئے ہندوستان میں دوسرے بہت سے رسائل و اخبارات ہیں۔ حیات نو کے زریں اور قیمتی صفحات کسی دوسرے مفید اور مثبت کام میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ابو المجاہد زاہد صاحب کی غزل کا یہ شعر جو اسی شمارے کی زینت ہے، ہمیں چوکنا رکھنے کے لئے کافی ہے۔

میں گرا تو وہ بڑھا مجھ کو اٹھانے کیلئے — بھیڑ میں دانستہ خود جس نے مجھے دھکا دیا

برادر مکرم جناب عبید اللہ فہد فلاحی صاحب کی کتاب پر ڈاکٹر صلاح الدین عمری صاحب کا تبصرہ خوب ہے۔ تبصرہ نگار نے تحریک اہلحدیث کے تعلق سے جن باتوں کی نشاندہی کی ہے وہ لائق توجہ اور قابل اصلاح ہیں۔ امید ہے کہ مصنف محترم دوسرے ایڈیشن میں (جو عنقریب نکلنے والا ہے) اس پر نظر ثانی کر لیں گے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ فہد صاحب کی کتاب "مسلم لیگ" کے ذکر سے خالی ہے، اور محترم تبصرہ نگار صاحب بھی اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کو بھی مصنف کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے۔ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ "مسلم لیگ" کا تذکرہ نہ کر کے برادر مکرم نے ایک ایسی تحریک کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی کوششوں سے ملت اسلامیہ ہند کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا (خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو) جس کے لئے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

جامعہ کے لیل و نہار

ڈیڑھ مہینہ کی طویل چھٹی کے بعد ۸ شوال مطابق ۱۶ جون ۱۹۸۶ء بروز دوشنبہ جامعہ میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا۔ تمام طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے گھروں سے آ گئے اور تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس سال کم و بیش ۱۰۰ نئے طلبہ کو منظوری دی گئی ہے اور کم و بیش ۳۰ نئی طالبات کو تعلیم کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ جامعہ طلبہ اور طالبات کے لئے تعلیم کے یکساں اور بہتر مواقع فراہم کرنے کے لئے کوشاں ہے اور اپنی بھرپور جد و جہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ جامعہ میں بورڈنگ کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اعلیٰ درجات کے لئے اس وقت جامعہ کے جنوب مشرق میں نئی عمارت کے پاس ۶ کمرے اور ایک بڑا ہال زیر تعمیر ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح کچھ مزید جگہ نکل سکے گی۔

جامعہ کے شعبۂ نسواں میں ہاسٹل کی تنگی علی حالہ برقرار ہے تاہم اوپری منزل پر ۲ کمرے مزید زیر تعمیر ہیں امید کہ جلدی مکمل ہو جائیں گے۔ پریاگنج سے متصل مغرب کی طرف جامعہ سے قریب طالبات کے لئے ۵ بیگھہ زمین حاصل کر لی گئی ہے۔ پلاننگ کے بعد ان شاء اللہ جلد کام شروع ہو گا۔ اس طرح طالبات کے لئے مزید مواقع فراہم ہو سکیں گے۔ اہل خیر حضرات کے تعاون کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

جامعہ کے نئے تعلیمی سال کے آغاز پر جہاں بہت سے مہمان اپنے بچوں کو داخل کرانے کیلئے تشریف لائے وہیں ادب اسلامی کے نقیب، ادارہ ادب اسلامی کے روح رواں، دنیائے غزل کے بادشاہ جناب حفیظ میرٹھی صاحب بھی تشریف لائے۔ آپ اپنی بچی کو لے کر آئے تھے جو کلیۃ البنات میں عالمیت کے آخری سال میں زیر تعلیم ہے۔ "تابش مہدی" جو ایک اچھے شاعر اور غزل گو ہیں پہلے ہی تشریف لا چکے تھے۔ ان کے آنے سے جامعہ میں شعر و شاعری کا ایک ماحول بن گیا اور ۱۵ جون کو بعد نماز عشاء ایک ادبی نشست ہوئی جس میں تابش

ANNOUNCEMENT

ISLAMIC DEVELOPMENT BANK

SCHOLARSHIP PROGRAMME FOR STUDENTS

FROM NON - MEMBER COUNTRIES

P. O. BOX - 5925, JEDDAH - 21432

KINGDOM OF SAUDI ARABIA

(For Students appearing in I. Sc. Exmas, and desire to study MBBS or B. Sc. Engg)

The Islamic Development Bank, Jeddah, in pursuance to its policy of helping Muslim students belonging to Muslim communities throughout the world, is pleased to announce 60 scholarships for students belonging to the Muslim community of India for studies in a recognized university/ college in the field of Medicine (MBBS Course) or Engineering (Bachelor Degree Course).

The amount of scholarship for a student will be US 50/- per month plus a grant equivalent to two months scholarship for clothing per year and a grant equal to one month of scholarship for books. In addition the IDB will pay the tution and other official expenses related to the study and treatment in government or university hospital. The scholarship is for those meri torious but financially weak students who intend to seek admission in the first year course of MBBS or B. Sc. Engg. in the 1986 - 87 session. Applicants for the scholarship should meet the following requirements :-

1. Should have passed Intermediate Science Examination or its equivalent with destinction in English, Mathematics, Science, Physics, Biology and Chemistry.
2. Should be a full time first year student studying in India and must not accept any remunerative employment.
3. Not in receipt of any other scholarship.
4. The student or his/her parent is financially unable to pay for his/her education.

مہدی صاحب نے لوگوں کے دل جیت لئے اور اپنی غزلوں سے سامعین کو بہت محظوظ کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینہ پہلے خود آپ دیکھا کریں	انگلیاں پھر کسی پر اٹھایا کریں
آدمیت کی چادر ہے ہر جسم پر	آدمی کون ہے کس سے پوچھا کریں
کیا جانے کس حال میں ہے میرا پڑوسی	کل سے میرے گھر میں کوئی پتھر نہیں آیا
ہم بھی سچائیوں کے پرستار ہیں	دو ہیں دار ہم بھی گنہگار ہیں

دوسرے دن جب حفیظ میرٹھی صاحب تشریف لائے تو یہ خواہش دو آتشہ ہو گئی اور اہل ذوق نے پھر ایک پروگرام ترتیب دیدیا۔ ۱۹/ جون کو بعد نماز عشا حفیظ صاحب اور تابش مہدی صاحب پھر غزل سرا ہوئے اور سامعین ہر شعر پر بے خود ہو کر داد دے رہے تھے۔

تابش مہدی نے اپنے مخصوص انداز میں ترنم کے ساتھ جب یہ اشعار پڑھے تو مجمع نے داد و تحسین کی بارش کر دی ع

سارے یوسف صفت دار پر چڑھ گئے	ہر گنہگار دامن بچا لے گیا
شہر میں میرے ہی جسم پر تھی ردا	کیا خبر کون وہ بھی چرا لے گیا
جب اندھیرے بڑھے اپنی اوقات سے	حوصلوں نے ہمیں راستہ دیدیا
تیز تر آندھیوں میں بھی جلتا رہا	میرے مالک نے ایسا دیا دیدیا

پھر جب حفیظ میرٹھی صاحب اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ترنم کے ساتھ غزل خواں ہوئے تو مجمع پر ایک سحر چھا گیا اور ہر ہر شعر پر مجمع بے قابو ہو گیا۔ حفیظ صاحب کی پوری غزل تو حیات نو کے آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، سر دست چند اشعار سنتے جائیے۔

ستم کو وہ کرم ثابت کریں گے	ذہانت ان کو بخشی ہے خدا نے
یہ کہہ کر شیخ کو ساقی نے چھیڑا	ہمارے قدرداں ہیں یہ پرانے
حفیظ اب قومی یکجہتی یہی ہے	کہ مسجد میں بتوں کے ہوں ٹھکانے

5. Students benefiting from this scholarship must undertake to serve his/her community and country after completion of their studies for a period not less than the duration of the scholarship.

6. At the time of consideration of application he/she should have secured admission in first year of MBBS or B. Sc. Engg. course in the current session 1986 - 87 Students studying in classes other than first year need not apply.

7. The scholarship is offered as a loan to be refunded in instalments by the students to any body or organization within his community named by the IDB after the students completes his/her education and starts employment.

Scholarship application forms are available, free of cost, from :

Students Islamic Trust (SIT)

2035, Qasimjan Street, Delhi – 110006

Phone : 271793, Telex : 61998 HPIT IN

Cable : NEWERABUK

The application forms, duly completed/signed by the students with the necessary letters of recommendation, etc should be sent to the address for finalselection at the IDB, Jeddah.

Application should be received in SIT office before the 30 th July, 1986.

Note : Candidates appearing in the Intermediate (Science) Exams. and desire to seek admission in MBBS or Engg. courses, should apply for scholarship Their application will be considered after they securex the admission in the relevent course and intimate the SIT of it along with the necessary certificates.